دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈہ

کی

۴۵ وین جلد

از جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تا جون سنہ ۱۹۴۰ء

مُرتبۂ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈہ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۴۵

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء تا جون سنہ ۱۹۴۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شعراء

فہرست مضامین

جلد ۴۵

جنوری ۱۹۴۰ء تا جون ۱۹۴۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

مقالات

تلخیص و تبصرہ

اخبار علمیہ

ادبیات

"جلد ۴۵" ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۰ء "عدد ۱"

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

معارف کا پہلا پرچہ جولائی ۱۹۱۶ء میں نکلا تھا اور آج ۱۹۴۰ء کا آغاز ہے، یعنی معارف کی زندگی کا اب چوبیسواں سال ہے، اس کا بچپن یورپ کی بڑی جنگ میں گذرا، اور اب اس کی جوانی یورپ کی ایک اور بڑی لڑائی میں گذر رہی ہے،

---

۲۴ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے، مگر انہیں ۲۴ برسوں میں خدا جانے کتنے کاغذ کے پتلے رسالوں کی صورت میں عرصۂ وجود میں آئے اور فنا ہوئے، اس حالت میں معارف کی ۲۴ برس کی ایسی زندگی جس میں ایک مہینہ کے لئے بھی اس نے کبھی کوئی ارادی یا جبری تعطیل نہیں منائی، اللہ تعالیٰ کے ہزار ہزار شکریہ کی مستحق ہے،

ان ۲۴ برسوں میں انقلابات کے کئی طوفان اٹھے، اور سیاسیات کی کئی آندھیاں آئیں مگر اس پر بھی خدا کا شکر ہے کہ جس راستہ کو سمجھ بوجھکر ایک دفعہ صحیح مانا، اب تک اسی راستہ پر قدم ہے، دین کی راہ سے علم کی، یا یوں کہئے کہ علم کی راہ سے دین کی خدمت زندگی کا پہلا مقصد تھا، اور آج بھی وہی ہے، والحمد للہ، اس کے سوا جو چیزیں معارف میں آجاتی ہیں ان کی حیثیت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے لحاظ کے سوا کچھ اور نہیں،

دسمبر ۳۹ء کے اخیر ہفتہ میں ہماری ادبی اور تعلیمی دو کانفرنسیں دو شہروں میں ہوئیں، پہلی کانفرنس انجمن ترقی اردو کی طرف سے دہلی میں ہوئی، جس کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیم حیدرآباد دکن نے فرمائی، نواب صاحب ممدوح نے اپنے والد بزرگوار نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی سے علم وفن اور اردو ادب کی محبت ورثہ میں پائی ہے، ان کی متانت، سنجیدگی، دینداری، اور ساتھ ہی وسعتِ نظر اور وسعتِ قلب اس نئے دور میں عدیم المثال ہے، وہ ہندوستان کی واحد اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور دار المصنفین کے نائب صدر نشین ہیں، ان کا خطبۂ صدارت ان کے سنجیدہ غور و فکر کا نتیجہ تھا، اور ہندوستان کی قوموں میں اتحاد و محبت کا پیام،

کانفرنس میں زبان کی ترقی اور اصلاح کی کئی تجویزیں منظور ہوئیں، جن میں سب سے اہم دو ہیں، صوبہ یوپی و بہار کی یونیورسٹیوں میں اردو کے ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ تھا، اور دوسری ایک اصلاحی کمیٹی کا قیام جو زبان کے ادبی و نحوی مسئلوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرے، ایک اور تیسری تجویز بھی خاصی اہمیت رکھتی ہے، یعنی انجمن کے مرکز میں اردو مطبوعات کے ایسے کتب خانہ کی فراہمی جس میں سال کے تمام مطبوعات ایک جگہ ہوں، اور اس کی صورت یہی ہے کہ انڈیا آفس لائبریری کی طرح انجمن کے دفتر میں اردو کی ہر مطبوعہ کتاب کا ایک نسخہ لازماً بھیجا جائے، انجمن کی طرف سے اگر اس کا باقاعدہ اعلان ہوتا رہے تو ممکن ہے مصنف اور پبلشر اس ضرورت کی طرف توجہ مبذول کریں،

مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ہوا، اس کی صدارت کی کرسی پر حیدرآباد دکن کے سب سے بڑے جاگیردار نواب کمال یار جنگ بہادر جلوہ افروز تھے، موصوف گو پہلی بار ہندوستان کی پبلک میں ظاہر ہوئے، مگر ان کی سنجیدہ رائیں، اور گہرے خیالات توجہ سے سننے کے قابل تھے، ان کا خطبہ گو لفظوں میں مختصر مگر معنی میں وسیع تھا، انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک خاص تعلیمی اسکیم پر جو ان کی قومی و مذہبی ضروریات کے مطابق بنائی گئی ہو بہت زور دیا۔

ان کی یہ تجویز ان مسلمان اہلِ فکر کے لئے جو مسلمانوں کے مستقل اور علحدہ تعلیمی نظریہ کے حامی ہیں، بہت کچھ دلچسپی کا باعث ہے، مگر افسوس ہے کہ ان کی تجویز کے مطابق جو سات اشخاص اس کام کے لئے چنے گئے ان میں سے ایک دو کے سوا بقیہ کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اولاً کہاں تک اس مقصد سے متفق ہیں، اور ثانیاً کہاں تک وہ اسکی اہلیت رکھتے ہیں، اور اس پر بھی افسوس یہ ہے کہ اتنی بڑی اہم تجویز بھی صوبہ وارانہ اسپرٹ سے خالی نہیں،

اس سال کانفرنس کے اردو شعبہ کے اجلاس میں بنگال کے مسلمانوں میں ایک خاص قسم کا خوشگوار ذہنی انقلاب محسوس ہوا، یعنی وہ اردو کو بحیثیت ایک عام ہندوستانی زبان کے ماننے اور بنگال میں اس کے پھیلانے کیلئے خواہشمند نظر آتے تھے، اور ان کو محسوس ہوتا تھا کہ صرف زبان کی بیگانگی نے ان کو باقی اسلامی ہندوستان سے ایک طرح سے منقطع کردیا ہے، انھوں نے خود ہی اس کی تحریک کی کہ وہ بنگالی زبان کو بھی سندھی، ملیالم اور پشتو کی طرح عربی خط میں لکھیں، اور اسکی سند میں انھوں نے سو برس پہلے کی ایک ضخیم منظوم بنگالی کتاب شہادت نامہ پیش کی جو بنگلہ زبان اور عربی خط میں تھی،

کانفرنس کے شعبہ اسلامیات کی صدارت چودھری عزیز الحق وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی نے کی، موصوف نے جب سے یونیورسٹی کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے اس بات کی کوشش میں ہیں کہ یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و علوم کی ایک نئی کرسی قائم کریں، ان کا خطبہ ان کے اس خیال کا آئینہ تھا،

ہمارے فاضل دوست مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی جو کئی سال سے انگریزی میں قرآن پاک کا ترجمہ کرنے اور اس پر مفید حواشی لکھنے میں مصروف تھے، اپنے اس مقدس فرض سے بحمد اللہ کہ سبکدوش ہوگئے، یہ انگریزی کا پہلا ترجمہ ہے جو خالص اہل السنۃ گروہ کے خیالات کے مطابق کیا گیا ہے، فاضل مترجم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کی اشاعت کی خوش نصیبی کس خوش قسمت کو حاصل ہوتی ہے، لیکن سلسلۂ آصفیہ سے بڑھ کر اس کا استحقاق کس کو ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقالات

مولانا سید سلیمان ندوی

کا

پہلا "کارنامہ"

از مولانا سید مناظر احسن گیلانی، صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن،

کارنامہ اور افکار نامہ

ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند کے علمی و دینی حلقوں میں جس کے قلم سے پھوٹے ہوئے چشمے انسانی دل و دماغ کی آبیاریوں میں آج مسلسل تیس چالیس سال سے مصروف ہیں، حیرت نہ ہونی چاہئے کہ اردو زبان کے اسی اعظم المصنفین کی ایک جدید تصنیف کو اس کا پہلا "کارنامہ" میں کیوں قرار دے رہا ہوں،

واقعہ یہ ہے کہ مولانا (بارک اللہ فی عمرہ وعلمہ) کے علمی خدمات کا زیادہ تر تعلق اب تک ان ہی مسائل سے رہا جن کا بڑا مقصد میرے خیال میں یہی تھا کہ "پڑھا جائے اور سمجھا جائے"، نئے حالات نے جدید ذہنیتوں میں جن نئی نئی الجھنوں کو پیدا کردیا تھا، خدا ہی جانتا ہے کہ اعظم گڈھ کے اس زاویہ نشین درویش کے قلم نے ان کی گرہ کشائیوں میں کتنی جلیل وعظیم خدمتیں انجام دی ہیں، جب جائزہ لیا جائے گا تو اسلام کے ایک مخلص فقیر نے علم کے جن بیش بہا سرمایوں کو وقف عام کیا ہے ان کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز

ہو کر انشاء اللہ تعالیٰ ہزاروں تک پہنچی ہوئی نظر آئے گی (جزاھم اللہ ورفقائہ عنا وعن امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیر الجزاء)

لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں "کہ پڑھا جائے اور سمجھا جائے" سے زیادہ جس میں "کیا جائے" کا مطالبہ کیا گیا ہو، باضابطہ شکل میں مسلمانوں کی عملی زندگی پر براہ راست اثر انداز ہونے والی چیز سب سے پہلے آپ کے قلم سے جو نکلی ہے، وہ **سیرۃ النبی** (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جلد ششم ہی ہے،

کارنامہ | اسی لئے آپ کی گذشتہ تصنیفات کو گویا "افکار نامہ" قرار دے کر آپ کی اس جدید تالیف کی تعبیر میں نے "کار" نامہ سے کی ہے جس میں علم سے زیادہ عمل اور "افکار" سے زیادہ "کار" کی تصحیح کے لئے وہ نظام مرتب کیا گیا ہے، جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے ایک ایک پہلو کو پیش نظر رکھکر کوئی مرتب کر سکتا تھا، بحمد اللہ کہ مؤلف (دام اللہ ظلہ) کی سعی مشکور ہوئی، اور ان کی کوشش کامیاب کوشش بن کر رہی، ان دماغ سوزیوں، اور جاں کاہیوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے، جو مؤلف ممدوح کو اس راہ میں اٹھانی پڑی ہیں اس راہ کی مشقتوں سے وہی واقف ہو سکتا ہے، جس نے کبھی اس میں چلنے کی خود کوشش کی ہو، لیکن راہ کی دشواریوں نے تھکا کر اسے بٹھا دیا ہو، جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا، یہ کام صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ جہاں تک میرے معلومات کا تعلق ہے، عربی زبان کے حساب سے بھی اپنی آپ نظیر ہے، خدا کا شکر ہے کہ طباعت و کتابت کی زیبائیوں کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ میں یہ کتاب پہنچ گئی، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان مسلمانوں کی بلند کوٹھیوں میں بحمد اللہ آج بخاری و مسلم، ابوداؤد و ترمذی کی وہ روایتیں اس کتاب کی راہ سے غالباً پہلی دفعہ داخل ہوئی ہیں، جن کی جگہ ادبار زدہ قوم نے آج صرف مسجد کے گوشوں، اور عربی مدارس کی چٹائیوں تک محدود کر دی تھی،

کارنامہ کی اولیت | خاکسار کو بھی جب اس گرامی قدر، رفیع المنزلت مقدس کتاب کے مطالعہ کی سعادت نصیب ہوئی تو منصفانہ اعتراف کی جو روشنی دل نے اپنے اندر محسوس کی اسی کا اظہار اپنے رنج کے ایک

نیاز نامہ میں کر دیا گیا تھا مصنف علامہ[1] کی یہ ذرہ نوازی تھی کہ آپ نے ایک غیر اہم رائے کا تذکرہ "معارف" میں فرما دیا گویا "دیلش بیاز" کا اب قدرتی طور پر پابند ہو گیا ہوں،

نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میرے دل میں ہے، اس کی صحیح تعبیر پر مجھے قدرت بھی ملے گی یا نہیں، لیکن کوشش کرتا ہوں، جذبات کو منطق کے قالب میں ڈھالنا آسان نہیں ہے، لیکن جب یہی کہا جاتا ہے تو کرتا ہوں، مجھے اندیشہ ہے، کہ میری گفتگو میں کچھ طول پیدا ہوگا، ناظرین معارف سے معافی کا خواستگار ہوں، ہوش والوں کی چیزیں تو ہمیشہ ہی پڑھتے رہتے ہیں، کبھی دیوانوں کے بڑ سے بھی لذت حاصل کر لیا کیجئے، بطور تمہید کے پہلے کچھ باتیں سن لیجئے، پھر اصل کتاب کے متعلق تو مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے آیندہ عرض ہی کروں گا،

مذہب اور اس کا موضوع | بات یہ ہے کہ یوں تو مذہب نام ہی اس علم کا ہے جس میں بجائے آفاقی کائنات (یعنی غیر انسانی موجودات) کے خود انسانیت، انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے، اور اسی لئے میرا خیال ہے کہ جس طرح دنیا کے سارے علوم کے لئے پہلے ایک موضوع طے کر لیا جاتا ہے، اور

---

[1] علامہ کے لفظ کا ایک خاص لطیفہ ہے، جی چاہتا ہے کہ میں ہی اس کا تذکرہ کر دوں، مولانا سید سلیمان صاحب نے مجھ سے خود بیان فرمایا کہ اپنے گاؤں دیسنہ سے چھوٹی عمر میں پڑھنے کی غرض سے میں پھلواری شریف بھیجدیا گیا تھا، یہ عجیب بات ہے کہ پھلواری شریف کی صحبتوں نے خدا جانے میرے دل پر کیا اثر ڈالا کہ عموماً نمازوں کے بعد میں یہی دعا کیا کرتا تھا کہ خداوندا! مجھے علامۃ الدہر بنا دے، مولانا کا بیان ہے کہ اس وقت تک اس لفظ کے صحیح معنی سے بھی میں واقف نہیں تھا، بس اتنا سمجھتا تھا کہ یہ کوئی بڑا درجہ ہے، پھر جو کچھ ہونے والا تھا وہ ہوا، اور اچانک ملک کے طول و عرض میں آپ کو "علامہ سید سلیمان ندوی" کے لقب سے لوگوں نے ملقب کرنا شروع کیا، سید صاحب فرماتے تھے کہ کاش! بجائے اس لفظ کے دعاؤں میں کسی حقیقت کا مطالبہ کرتا تو زیادہ خوش قسمت ثابت ہوتا،

افسوس ہے کہ اب اس لفظ کے استعمال میں عوام اتنی بے احتیاطیاں برتنے لگے ہیں کہ ڈرامانویسوں اور "اداکاروں" تک کے نام کے ساتھ بعض اوقات علامہ کا لفظ اب لکھا جاتا ہے، اسی لئے مجھے تو اب مولانا کے ساتھ اس لفظ کے استعمال کرنے میں کچھ جھجک سی ہوتی ہے، معارف کے ناظرین معاف فرمائیں، کہ خاکسار نے ان کے علامہ کو صرف مولانا کے لفظ سے خطاب کیا ہے، (۲)

اسی کے عوارض و صفات کی اس میں تحقیق کی جاتی ہے، اگر مذہب کو بھی اس لحاظ سے دیکھا جاے تو اس کے مباحث کا بھی حقیقی موضوع انسان ہی قرار پاے گا،

مذہب کا موضوع انسان آدمی بنتا ہے، بنتے ہوے وہ بلند ہوتا ہے، اور اتنا بلند ہوتا ہے، کہ ملائکہ سے بھی آگے نکل جاتا ہے، یوں ہی آدمی بگڑتا ہے، بگڑتے ہوے وہ گرتا ہے، اور اتنا گرتا ہے کہ انعام اور چوپایوں سے بھی زیادہ اضل وگم کردہ راہ ہوکر بھٹکنے لگتا ہے، غور کیا جاے تو مذہبی مسائل و مباحث کا آخری خلاصہ اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے، اسی بنا پر میں اکثر کہتا ہوں کہ عام علوم وفنون کے مقابلہ میں مذہب کے "صحیح مقام" کو واضح کرنے والی شے کیلئے بھی اگر کسی فنی نام کا تجویز کرنا ہی ناگزیر خیال کیا جاے تو بجاے الٰہیات (اللہ یعنی دیوتاؤں سے بحث کرنے والا علم) یا دینیات (مذاہب وادیان کے حالات کا بیان کرنے والا علم) کی جگہ اس کا موزوں ترین نام اپنے حقیقی موضوعِ بحث کے اعتبار سے "انسانیات" سے بہتر اور کوئی دوسرا لفظ نہیں ہوسکتا، گویا اس کے معنی یہ ہوے کہ "ہر چیز سے تو انسان بحث کرتا ہے، لیکن خود انسان سے بھی جس علم میں بحث کی جاتی ہے، اسی کا نام مذہب ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ ان پہلوؤں کے سوا جن میں حیوان بھی آدمی کے شریک اور ساجھی ہیں، دنیا کے عام مذاہب میں انسانیت کے ان تمام شعبوں کو زیر بحث لایا گیا ہے، جن کے بننے اور بگڑنے پر خود انسان کے بننے اور بگڑنے کا مدار ہے، عام مذاہب خصوصاً اسلام میں کس حد تک اس معاملہ میں کاملیت پائی جاتی ہے، اس کا صحیح اندازہ ان ہی لوگوں کو ہوسکتا ہے، جن کا دماغ اس خاص عصری مغالطہ سے خالی ہو جس میں مبتلا ہونے والے عموماً مذہب میں ان چیزوں کو تلاش کرتے ہیں جو اس کے موضوعِ بحث سے خارج ہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ ان

لہ یہ نکتہ ابوالبرکات بغدادی کی کتاب المعتبر سے ماخوذ ہے، بغدادی نے لکھا ہے کہ یونانی فلاسفہ فلسفہ کے رنگ میں اپنے دیوتاؤں اور اصنام پر جو بحث کرتے تھے اسی کا نام الٰہیات انھوں نے رکھا تھا،

چیزوں کو جو خود انسان نہیں ہیں، لیکن انسانوں ہی کے لئے ہیں، ان کی ترقیوں کو آج جو انسانی ترقیوں کے نام سے مشہور کیا جاتا ہے غور کرنا چاہئے کہ اس میں حقیقت کا کتنا حصہ شریک ہے،

انسانی ترقی وتنزل کا فلسفہ کس قدر عجیب ہے کہ بڑھ رہی ہیں، انسانی سواریاں لیکن غل مچایا جارہا ہے کہ انسان بڑھ گیا، آگے بڑھ رہے ہیں، لہو ولعب کے وہ آلات جن سے آدمی دل بہلاتا ہے، لیکن کانوں کو بہرا کردیا گیا ہے اس چیخ سے کہ آدمی ہی بڑھ گیا، ستھرے اور شستہ ہورہے ہیں وہ الفاظ جن سے انسان اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے، لیکن شور ہے کہ دیکھو انسان کتنا ستھرا اور کتنا شستہ ہوگیا، اور لطف یہ ہے کہ ان ہی مادی انسانی موجودات کی ترقیوں کو انسانی ترقی باور کرکے اس علم سے کتنی سخت مجرمانہ بے اعتنائیاں برتی گئیں اور برتی جارہی ہیں، جو خود انسان کے ترقی وتنزل سے بحث کرتا تھا، اس باب میں غلو سے کام لیا گیا، اور اس حد تک لیا گیا، کہ کتوں اور کتوں کے پلوں، سانپ اور سانپ کے بچوں کی بھلائی اور برائی سے جن فنون میں تحقیق وتنقیح کی جاتی تھی کوئی اچھا سا علمی نام اس کا تجویز کرکے علمی اداروں میں ان کے لئے بھی کرسیاں بچھائی گئیں، ان کے لئے درس کے خاص کمرے مخصوص کئے گئے، متعلقہ تجربہ خانوں پر ہزاروں اور لاکھوں روپئے بہاے گئے، اور بہاے جارہے ہیں، لیکن اسی کے مقابلہ میں جو علم آج صرف سروں کا درد اور سینوں کا بوجھ قرار دیا گیا ہے وہ محض وہی علم ہے، جس میں کتوں اور کتوں کے بچوں سے نہیں، بلکہ آدمی اور صرف آدمی کے بچوں کے بناؤ اور بگاڑ ترقی وتنزل کی راہوں کی تلاش وجستجو کی جاتی تھی،

نتیجہ یہ ہوا، اور ہورہا ہے، کہ سب بڑھ رہے ہیں، اور بڑھاے جارہے ہیں، لیکن ارتقاء وعروج کے ان ہنگاموں میں جو مسکین بصد کس مپرسی گر رہا ہے اور بری طرح گر رہا ہے، ان ہی چیزوں کی بلندیوں سے ٹپک ٹپک کر گر رہا ہے جس پر چڑھ کر پکارا گیا تھا کہ ہم سے اونچا کون ہے؟ وہ انسان اور صرف انسان ہی سارا بناؤ، بگڑے ہوے انسانوں کے ہاتھوں میں پہنچکر خدا کی زمین پر اس "بگاڑ" کی دھمکیاں دے رہا ہے، جس کی نظیر آسمان کی آنکھوں نے اس وقت بھی نہیں دیکھی تھی، جب اپنی بگڑی ہوئی یا قدرتی شکلوں میں یہی

ترقی یافتہ چیزیں ان انسانوں کے قبضہ میں تھیں جن پر آج پستی و پس ماندگی کا الزام ہے، دوروں سے قریب ہوتے ہوئے، اسی چیز سے (یعنی خود اپنی ذات سے) آدمی کا دور ہو جانا، یا دنیا کی ہر چیز کو اپنے حافظہ میں بھرتے ہوئے خود اپنے حافظہ سے پھسل کر باہر نکل پڑنا اس نہ حل ہونے والے معمہ کا حل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے، جو کہا گیا تھا کہ

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ، (حشر-۳) بھول گئے وہ اللہ کو پس بھلا دیا اللہ نے انکو ان ہی سے

خود انسان کی اپنی بڑائی نہیں بلکہ جو چیزیں انسانوں کے لئے ہیں ان کی بڑائیوں پر انھیں خود اپنی کبریائی کا مغالطہ ہوا، اتنا مغالطہ کہ اپنی اس غیر واقعی جھوٹی بڑائی میں انھوں نے خدا تک کی گنجایش نہیں پائی، اور قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ جو اپنے اندر سے خدا کی بڑائی کو کھو بیٹھتا ہے، ٹھیک اسی وقت اپنے کو بھی خود اپنے اندر سے کھونا پڑتا ہے اور آج یہی افتاد ہے جس میں آدمی کا ملعون حافظہ مبتلا ہے، جب تک خدا اور اس کی بڑائی ان کے حافظوں میں پھر واپس نہیں ہوتی ناممکن ہے کہ ان کو خود اپنے حافظوں میں واپس ہونے کا کبھی موقع عطا کیا جائے،

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ جو پہلے گذر چکے ان میں خدائی طریقہ جاری ہوا، اور خدا

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (فتح-۳) کے طریقہ میں تبدیلی تم کبھی نہیں پا سکتے،

بات بہت طویل ہو گئی، لیکن آج قدم قدم پر جو ٹھوکریں ہیں، کیا کیا جائے، کہ حقیقت تک رسائی اس وقت تک ہو بھی تو نہیں سکتی جب تک چلنے والوں کو مسلسل ان سے خبردار نہ رکھا جائے،

اسلام اور فلسفۂ انسان | بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ مذہب کا حقیقی موضوع بحث چونکہ خود انسان اور اس کی انسانیت ہے اسی لئے عام مذاہب و ادیان میں عموماً اور اسلام جو اس علم کی آخری و کامل ترین شکل ہے اس میں انسان کے ان تمام پہلوؤں کو روشن کیا گیا ہے، جن پر ان چیزوں کی نہیں جو انسانوں کے لئے ہیں بلکہ خود براہِ راست انسان ہی کی ترقی و تنزل کی بنیاد قائم ہے، اور آج اندھیرے میں تیر چلانے والی

ناقص عقل کی راہنمائی میں نہیں جو ہزار غلطیوں کے بعد کسی ایک آدھ صحیح بات تک پہنچتی ہے، بلکہ حق تعالیٰ کے محیط و کامل کلی علم کی روشنی میں انسانی زندگی کا مکمل دستور قرآن اور مبلغِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کی شکل میں بنی آدم کے پاس اعتماد و وثوق کے ان تمام ذرائع کے ساتھ موجود ہے، جو کسی چیز کی صحت و واقعیت کے متعلق سوچے جا سکتے ہیں،

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو چیزیں انسان نہیں ہیں، خواہ آدمی ان کے متعلق علم محض علم اور جاننے کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہو، یا ان سے واقف ہو کر زندگی کے عام کاروبار میں سہولت پیدا کرنا چاہتا ہو کوئی بھی ہو، ان کے متعلق عقلی غلط فہمیوں کا انسانی زندگی پر چونکہ مضر اثر مرتب نہیں ہوتا، اس لئے ان علوم و فنون کی ذمہ داری اگر عقل کے سپرد کر دی گئی، تو اس میں کیا حرج تھا، بلکہ انسانی عقل کی تکمیل کی سچ پوچھو تو یہی ایک متعین شکل ہے، مشق کے تختوں سے بھری ہوئی کائنات کھول دی گئی ہے تاکہ ان میں سے جس تختہ کو چاہے عقل اٹھائے اور اپنی ادراکی قوتوں کی اسے مشق گاہ بناتی چلی جائے کاٹتی جائے اور بناتی جائے، لاکھ غلطیوں کے بعد اگر ایک تیر بھی اس کا نشانہ پر بیٹھ گیا، تو یہی اس کی معراجِ کمال ہے، رہی غلطیاں تو ظاہر ہے کہ ان سے چونکہ خود انسان میں کوئی غلطی پیدا نہیں ہوتی، اس لئے اس کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے، فرض کیجئے کہ آدمی بجائے زمین کے مثلاً ایک مدت تک آسمان یا آفتاب ہی کی گردش کو دن رات کا سبب سمجھتا رہا، تو بتایا جائے کہ انسان کی کس ضرورت پر اس غلطی کی زد پڑتی تھی، اور یہ تو ان چیزوں کا حال ہے جنھیں صرف جاننے ہی کے لئے آدمی جانتا ہے، لیکن فطرت کے جن قوانین کے علم سے وہ نفع اٹھاتا ہے، پہلی بات تو یہی ہے کہ ان کے متعلق عدم واقفیت زیادہ سے زیادہ عقل کی جہالت ہو سکتی ہے، لیکن غلطی اس کو کون کہہ سکتا ہے، غلطی تو نام ہے کسی خلافِ واقعہ امر کے جاننے کا، واقعہ کا نہ جاننا یہ جہل تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کو غلط فہمی قرار دینا ظاہر ہے کہ خود غلط فہمی ہے، علاوہ اس کے دوسری بات یہ ہے کہ ان قوانین کی ناواقفیت کے زمانہ میں بھی اگر غور کیا جائے تو واقعی حیثیت سے آدمی کا کیا بگڑتا تھا،

بجائے بجلی کے قمقموں کے ایک زمانہ تک آدمی مٹی کے چراغوں سے اگر روشنی حاصل کرتا رہا تو بتایا جائے کہ اس سے انسان اور انسانیت کو کیا نقصان پہنچ رہا تھا، ان قوانین کے انکشاف سے سہولت ضرور پیدا ہوئی، لیکن سوال یہاں ضرر اور نقصان کا ہے، مشکل ہی سے کوئی چیز ایسی ثابت ہو سکتی ہے جس کی عدم واقفیت کی وجہ سے ثابت کیا جا سکتا ہو کہ آدمی کو نقصان پہنچ رہا تھا، بلکہ کچھ لوگ تو ایسے ہیں جنکا خیال ہے کہ آدمی کے باہر کی چیزیں جس نسبت سے بڑھ رہی ہیں خود آدمی اسی نسبت سے گھٹتا چلا جاتا ہے، چلنے پھرنے دیکھنے سننے حتی کہ جینے تک کی قوت اس کی اسی حد تک گھٹ گئی ہے جس حد تک ان ہی کاموں کے لئے باہر کی چیزیں بڑھ گئی ہیں، شاید لسان العصر مرحوم نے اپنے شعر

جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

میں نے اسی نظریہ کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن مان لیجئے کہ یہ اغراق و غلو ہے جب بھی یہ بات اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ عقل جب تک ان امور کے متعلق جہالت میں یا غلط فہمی میں مبتلا تھی اس وقت بھی، آدمی کا کچھ نہیں بگڑتا تھا، اس کے صحیح ہونے میں کون کلام کر سکتا ہے، اس لئے ایسے علوم جو ماورا انسانی حقائق سے بحث کرتے ہیں، اگر عقل کے حوالے کر دیئے گئے تو نہ حوالہ کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی، بلکہ ذہنی و عقلی قوتوں کی پرورش، اور تکمیل کی جب یہی صورت تھی تو آخر ایسا کیوں نہ کیا جاتا، لیکن غلطیوں اور جہالتوں کے سمندر میں غوطہ لگانے کے بعد کسی صحیح یافت کے موتی تک پہنچنے والی عقل کی پیٹھ پر اس انسان کی بحث و تحقیق کا بھی بوجھ لاد دیا جاتا، جس کے ایک ایک بگاڑ سے سارا نظام عالم بگڑنے لگتا ہے اور جس کے سلجھنے سے سب کچھ سلجھا ہوا رہتا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ کے جس عہد تک نسل انسانی آج پہنچی ہے، کیا پہنچ سکتی تھی؟ "انسانیت" کا بگاڑ جن خطرناک نتائج کی آج دھمکیاں دے رہا ہے، کیا لوگوں کے لئے اس میں عبرت نہیں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ قدرت نے جہاں دنیا کے سارے علوم و فنون کی تحقیق و تنقیح بحث و سوال کی ذمہ داری عقل کے تفویض کی، وہیں اس خاص علم کو جس کی بحث کا موضوع خود انسان ہے، اس کا رشتہ اپنے محیط و کامل کیسا تھ

جوڑ کر آج نہیں بلکہ ہمیشہ مسلسل براہ راست اپنی خاص نگرانی میں رکھا، اس علم کا یہی مقدس و محکم رشتہ ان تمام ایمانی اعتماد، اور یقینی بھروسوں کی "ضمانت" ہے، جو دوسرے عقلی علوم کے متعلق آدمی اپنے اندر نہیں پاتا اور نہ پا سکتا ہے اور جب کبھی تاریخی اسباب نے اس پاک رشتہ اور تعلق کو مضمحل کر کے اس علم میں بھی شک و شبہہ کی گنجائش پیدا کر دی، تو پھر نئے سرے سے اس کی ہمیشہ تجدید کر دی گئی، اور اسی تجدید کی آخری شکل کا نام قرآن ہے، اور قرآن ہی کی عملی تشریح کا نام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پاک زندگی ہے جس کے متعلق بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر کلی حیثیت سے حاوی ہے جن کا انسانیت کی بلندی و پستی سے تعلق ہے،

انسانیت کا مکمل دستور قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ملفوظات و افعال، الغرض آپ کی پوری زندگی میں علماً و عملاً ایک ایک نکتہ کا احاطہ کیا گیا ہے، اور خدا جزائے خیر دے اسلام کے ائمہ و علماء کو کہ انھوں نے ان تیرہ چودہ صدیوں میں انسانی زندگی کے اس مکمل دستور کے مختلف شعبوں کے کلیات سے جزئیات پیدا کر کے بیسیوں علوم پیدا کر لئے، آج عقائد، کلام، فقہ، اصول فقہ، تصوف وغیرہ مختلف ناموں کے جن اسلامی علوم و فنون کی کتابوں سے دنیا کے کتب خانے معمور ہیں یہ ان ہی اجتہادی کوششوں کے مختلف حصوں کے مختلف مظاہر اور شکلیں ہیں، لیکن بایں ہمہ یہ عجیب بات ہے کہ جہاں قرآن و حدیث کے ان مختلف پہلوؤں کے متعلق مستقل علوم بنائے گئے، اور ایک ایک کلیہ سے بلا مبالغہ لاکھوں جزئیات پیدا کئے گئے، سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیا صورت پیش آئی کہ انسانی زندگی کے اس نازک ترین عنصر کی طرف ان بزرگوں کی اسی قسم کی توجہ کیوں منعطف نہیں ہوئی جس کے متعلق نبوت کی زبان سے یہ اعلان کرایا گیا تھا

الا ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت	ہاں! آدمی کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے جب وہ
صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد	درست رہتا ہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور جب
کلہ الا وھو القلب۔ (بخاری)	وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے، ہاں! یہ قلب ہے

عمل کا معیار انسانی اعمال و افعال انفرادی ہوں یا اجتماعی ان کا تعلق جن فطری اخلاق و ملکات سے ہے، ان ہی کے سرچشمہ کی تعبیر اس حدیث میں قلب سے کی گئی ہے، مقصد یہ ہے کہ اسی سرچشمہ کے سلجھنے سے گویا زندگی کا سارا نظام سلجھ جاتا ہے، اور اسی کے الجھنے سے ہر چیز الجھ کر زیر و زبر ہونے لگتی ہے، یہ ایسا دعویٰ ہے جس کی تصدیق ہر زمانہ میں واقعات و مشاہدات سے ہوتی رہی ہے، اور وہ جو مذہب اور مذہبی امور سے لاپروائی برتنے والوں کی زبان پر بھی آج ایمانیات سے زیادہ "عمل صالح" کے فقدان کا ماتم اگرچہ صرف ماتم سنا جاتا ہے تو زیادہ تر اس کا راز بھی یہی ہے کہ "قلب" کی گتھیوں کی گرفت سے "کل" نہیں بلکہ "آج" ہی انسانی زندگی بت تملا اٹھی ہے، بلکہ مذہب کے متعلق کبھی کبھی بعض دلوں میں جو یہ وسوسہ ڈالا جاتا ہے کہ اس کا علمی نظام (ایمانیات) صرف عملی نظام (اخلاقیات) کی تصحیح کی ایک "مصلحت آمیز" فنی تدبیر ہے، تاکہ ضمیر، قانون، سوسائٹی کے حدود سے باہر بھی آدمی کے "الجھنے والے قلب" پر ان دیکھی نگرانی کے فرض کرنے کا امکان باقی رہے، اسکی وجہ بھی یہی ہے کہ جن لوگوں کے خیال میں "آج" کے لئے "کل" نہیں ہے، ان کے نزدیک بھی مذہب کا اخلاقی حصہ قدر و قیمت رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ناپاک خیال ان ہی لوگوں کا ہوسکتا ہے، جن کے علم نے خدا اور اس کے رسول کے علم سے پاکی نہیں حاصل کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ غیر شعوری طور پر بعض ایمانیوں کے قلم سے بھی "خدا کے لئے خدا کی رضامندی کے لئے عمل کی تصحیح کی جاتی ہو" کے بجائے اس کے مذہب کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے ان کے قلم سے ایسی بات نکل گئی اور نکل جاتی ہے جس کا حاصل العیاذ باللہ یہی ہوسکتا ہے کہ

"عمل کی تصحیح کے لئے خدا کو مانا جاتا ہے"

گویا اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اگر خدا پر ایمان لائے بغیر (خاکم بدہن) کوئی اپنی عملی تصحیح پر قادر ہو تو اس کے لئے خدا کا ماننا غیر ضروری ہو جاتا ہے،

بہرحال یہ تو قطعی غلط ہے کہ "عمل کے لئے خدا کو مانا جاتا ہے" بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کو پانے کے لئے آدمی

اپنے عمل کو اس کی مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہی انسان اور انسانیت کی بلندی کی واحد راہ ہے،

ایمان اور عمل اس لئے مذہب کا اصلی عنصر تو ایمان ہی ہے، اسی لئے ہمیشہ قرآن پاک میں عمل صالح پر ایمان کو تقدم عطا کیا گیا ہے، لیکن بایں ہمہ "عمل صالح" کی بھی مذہب میں کم اہمیت نہ تھی، اور چونکہ سارے اعمال و افعال کی بنیاد اخلاق و ملکات ہی پر قائم ہے، اس لئے اخلاقی مباحث سے یا نبوت کی اصطلاح میں قلبی مسائل سے اعمال کو وہی تعلق ہے، جو کسی عمارت کو اپنی بنیاد سے ہوسکتا ہے،

اسلام کے فلسفۂ اخلاق کی طرف سے عدم اعتناء لیکن واقعہ یہ ہے کہ مذہب کے جن مباحث کا تعلق عقائد و کلام سے ہے، اور جن کا شمار فقہی مسائل کے ذیل میں کیا جاتا ہے، جتنی جانفشانیاں ان کے متعلق ہر صدی میں علمائے اسلام کی جانب سے معرض ظہور میں آئیں، مذہب کے اخلاقی شعبہ کو بھی محنتوں اور جان کاہیوں کا وہ حصہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیوں نہیں عطا کیا گیا، جو دوسروں کو انتہائی فیاضیوں کے ساتھ دیا گیا،

ابتدا ہی سے عقائد اور فقہ کے متعلق کتابیں لکھی گئیں، اس کے مختلف عنوانوں پر مختلف حیثیتوں سے بحث کی گئی، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، خصوصیت کے ساتھ "اخلاقیات" یا دوسرے لفظوں میں "قلبیات" پر کوئی مستقل کتاب ابتدائی صدیوں میں شاید نہیں لکھی گئی، کچھ دنوں کے بعد زیادہ تر ان بزرگوں نے جن کا تصوف کی طرف میلان تھا، اس فن کے متعلق بھی کچھ لکھنا شروع کیا، لیکن ظاہر ہے کہ اس جماعت کے لوگوں سے اس نوعیت کے کام کی کہاں توقع کی جاسکتی تھی جو عقائد و فقہ کے علما، انجام دے سکتے تھے، ان علوم کے متعلق قرآن کی ایک ایک آیت زیر بحث لائی گئی صحیح حدیثوں کو غیر صحیح سے جدا کیا گیا، مختلف روایتوں میں تطبیق دینے کی جتنی شکلیں ممکن تھیں ان سب پر عمل کیا گیا، پھر ہر ہر مسئلہ کے متعلق جہاں تک ممکن ہوا، صحابہ اور تابعین کے اقوال و آثار جمع کئے گئے اور اس لئے ان فنون کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہو گیا، اور ان میں ہر ایک کی صورت ایک مستقل

علم اور باضابطہ فن کی ہوگئی، علماء کے باہمی اختلافات کی بنیاد پر، جن کا ہونا ہر علمی جد و جہد میں مختلف اسباب کے زیر اثر ناگزیر ہے، ان کی وجہ سے ان علوم میں مختلف مکاتبِ خیال قائم ہوگئے اور اب حال یہ ہے کہ ہر مکتبِ خیال کے ماننے والوں کے پاس اپنا ایک مستقل مسلک اور مستقل کتاب خانے ہیں، جن میں کوئی نہیں بتا سکتا کہ اب تک کتنی ہزار کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں،

لیکن "اخلاقی مسائل و مباحث" کی حیثیت ان سے بالکل مختلف رہی، جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اس فن کے متعلق کسی خاص کتاب کا کم از کم مجھے اب تک کوئی سراغ نہیں ملا، بعد کو صوفیہ کرام کی توجہ سے چھوٹے بڑے رسائل اس فن میں بھی مدون ہوئے، لیکن اوروں کا کیا ذکر کیا جائے اس فن کے امام الائمہ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ صاحب احیاء العلوم تک پر لوگوں کا یہ اعتراض ہے کہ بضاعتہ فی الحدیث مزجاۃ" بلاشبہ خود اپنے دماغ سے انھوں نے اس فن کے متعلق حیرت انگیز نکات پیدا کئے، لیکن نہ تو انھوں نے اس سلسلہ میں قرآن کی تمام آیتوں کے جمع کرنے کا التزام فرمایا ہے اور نہ ان آیتوں کے مختلف پہلوؤں سے جو مختلف نتائج پیدا ہوتے ہیں، انھوں نے اس قسم کی استیعابی بحثیں کی ہیں، جیسا کہ کلام و فقہ کے مسائل کے متعلق کیا گیا ہے، اور حدیثوں کے ذکر میں انھوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ تو گذشتہ بالا فقرہ ہی سے ظاہر ہی ہے، چند بزرگوں مثلاً حافظ ابن قیم نے اس میدان میں بھی اپنی شہسواری دکھانی چاہی ہے، لیکن ان کی جو کتابیں اب تک میری نظر سے اس سلسلہ میں گذری ہیں واقعہ یہ ہے کہ ان میں بھی اس فن کے تمام پہلوؤں کے سمیٹنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے، اس فن میں ان کی مشہور کتاب مدارج السالکین ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی یہ کتاب امام غزالی کے اس اعتراض سے پاک ہے کہ رطب و یابس ہر قسم کی حدیثوں سے انھوں نے کام نہیں لیا ہے، لیکن کتاب چونکہ منازل السائرین کی شرح ہے، اور "منازل السائرین" دراصل قرآن مجید کی ایک آیت "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کی ایک تفصیلی تفسیر ہے، ظاہر ہے کہ یہ بھی بڑا کمال ہے، شارح اور ماتن

دونوں کا کہ قرآن پاک کی ایک آیت سے انھوں نے "اخلاقی مسائل" کا ایک بڑا مجموعہ پیدا کیا، ایسا مجموعہ جو ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے لیکن پھر بھی ایک آیت کی تفسیر میں ان تمام مباحث کی گنجائش کہاں پیدا ہوسکتی تھی جو خاص کر اس کتاب میں پیدا ہوسکتی ہے، جو کسی آیت کے ساتھ مقید ہوئے بغیر حاصل ہوسکتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ کی کتابوں میں ان مباحث کا ایک ذخیرہ موجود ہے، اسی طرح شیخ اکبر صاحبِ فتوحات کے کلام میں جہاں سب کچھ ہے یہ بھی ہے، لیکن کوئی خاص کتاب ان تمام لوازم کے ساتھ جو کسی علم کی ترتیب کے لئے ضروری ہیں، ان بزرگوں نے بھی نہیں ارقام فرمائی،

ان کے سوا بھی مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً اخلاقی کتابیں لکھی گئیں، لیکن بعضوں نے تو قرآن و حدیث سے ہٹ کر صرف یونانی حکماء کی رایوں کی روشنی میں "اخلاقی نتائج" کے متعلق فیصلے صادر کئے ہیں، ابن مسکویہ، جلال الدین دوانی، نصیر الدین طوسی وغیرہ کی اخلاقی کتابوں کا یہی حال ہے، بعضوں نے حکما کے آراء کے ساتھ قرآن و حدیث کی روشنی سے بھی استفادہ کیا ہے، لیکن نہ اس میں قرآن کی ان تمام آیتوں کو جمع کیا ہے، اور نہ ان صحیح حدیثوں کو جن میں "اخلاقی مباحث" کے کلیات کا ذکر ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا مقصود بھی یہ نہ تھا، بلکہ تائید میں جہاں انھوں نے اور چیزیں پیش کی ہیں قرآن و حدیث کو بھی اسی ذیل میں ان لوگوں نے استعمال کیا ہے، راغب اصفہانی کی کتاب "الذریعہ" اس کی بہترین مثال ہے،

اسلامی دور میں عربی تصنیفات کے بعد جب فارسی زبان کے مصنفین کا عہد آیا، اور یہ واقعہ ہے کہ عربی سے زیادہ فارسی زبان میں "اخلاقی مسائل" کے متعلق لوگوں میں کتابوں کے لکھنے کا ذوق زیادہ پایا جاتا ہے لیکن اس کو کیا کہئے، کہ باوجودیکہ ان میں اکثر علماء ہیں، فضلاء ہیں، قرآن و حدیث کے ماہرین میں ان کا شمار ہے، لیکن انھوں نے تو غضب ہی کر دیا، کہ بجائے قرآنی آیتوں، صحیح حدیثوں، اور آثار صحابہ کے،

ادھر اودھر کے فرضی قصوں کے پیرایہ میں "اخلاقی درس" دینے کی کوشش کی، خصوصیت کے ساتھ حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کی کتاب گلستان اور بوستان نے اس باب میں خاصی شہرت حاصل کی میں یہ نہیں کہتا کہ ان بزرگوں کی کتابوں سے نفع نہیں پہنچا، بلکہ غرض صرف یہ ہے کہ اس فن کی خدمت نہیں معلوم کن وجہ سے اس طریقہ سے اب تک کسی سے نہ بن آئی، جو طریقہ کلام و فقہ، کی تدوین میں اختیار کیا گیا، اس کے بعد میں پھر اپنے اس مجمل دعویٰ کو دہراتا ہوں کہ

"اردو فارسی ہی میں نہیں عربی میں بھی یہ کام اب تک نہیں ہوا"

شاید ازل سے یہ بات اس شخص کے لئے مقدر تھی، جسے میرے خیال میں حضرتِ حق سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نگاری کے صلہ میں یہ انعام ملنے والا تھا، کہ سب سے پہلے اس اہم و ضروری اسلامی فن کی مکمل تدوین کا کام جیسا کہ اس کا حق تھا، اسی کے مبارک ہاتھوں سے انجام کرایا گیا، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

اس کتاب کی خصوصیات اسی تقطیع پر جس پر سیرت کی گذشتہ جلدوں کے پہلے اڈیشن شائع ہوئے ہیں ۴۱۲ صفحوں پر کتاب ختم ہوئی ہے، اصل خصوصیت تو کتاب کی وہی ہے، کہ اسلام کی "اخلاقی تعلیمات" کے متعلق پہلی دفعہ قرآنی آیتوں کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لاکر ان سے صحیح نتائج اخذ کئے گئے ہیں، سید صاحب نے اس سلسلہ میں کتابی تفسیروں سے زیادہ خود اپنی فہم اور اجتہاد سے کام لینے کی ایسے پیرایہ میں کوشش کی ہے کہ اسلام کے دوسرے مسلمات پر کوئی مضر اثر مرتب نہ ہو، جیسا کہ اس زمانہ کے مطلق العنانوں نے قرآن کو بھی العیاذ باللہ اپنے مشق کی تختیوں میں شریک کر لیا ہے، اور اس میں اتنی بے احتیاطی برتی جانے لگی ہے کہ ہندی اور اردو اصطلاحات تک سے بجائے عربی محاوروں کے قرآن کی تشریح میں اب فائدہ اٹھایا جاتا ہے، سید صاحب نے قرآنی آیتوں کے ساتھ ساتھ اس مسئلہ کے متعلق جہاں تک صحیح حدیثوں سے کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے کوشش کی ہے کہ وہ چھوٹنے نہ پائے، اور ان میں ایک ایسی ترتیب قائم فرمائی ہے، کہ

ایک سوال کے بعد دوسرے سوالات اس طرح حل ہوتے چلے گئے ہیں، کہ گویا ابتدا ہی سے ان کو کسی نے اسی طرح مرتب کیا تھا، اس میں جو مشقت اور محنت ان کو اٹھانی پڑی ہے، اس کا اندازہ وہ لوگ نہیں کر سکتے ہیں، جن کے سامنے پکا پکایا کھانا چن دیا گیا ہے، شہد کی مکھی ہی جانتی ہے کہ ایک ایک پھول سے رس چوسنے میں اس کو کتنی مدت اور کتنی قوت صرف کرنی پڑی ہے،

جیسا کہ میں نے پہلے ہی اشارہ کیا ہے، محض کثیر مواد، یا گرمی بیان کے لئے اس میں پوری احتیاط برتی گئی ہے، کہ کوئی ایسی حدیث درج نہ ہونے پائے جسے اربابِ فن نے ساقط الاعتبار قرار دیا ہو کسی ضرورت سے اگر کہیں ایسا ہوا ہے تو اس پر تنبیہ کر دی گئی ہے کہ فنی حیثیت سے اس حدیث کا کیا درجہ ہے، بہر حال قرآنی آیات کے سوا بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، موطا، دارمی، مسند احمد، مستدرک وغیرہ کتابوں سے مستند اور معتبر حدیثوں کا جو ذخیرہ مطلب اور ترجمہ کے ساتھ اس کتاب میں جمع ہو گیا ہے، میں گن تو نہیں سکا، لیکن تخمیناً دو ہزار سے اوپر ہی ہونگی، پھر ہر حدیث کی شرح میں جو جدید نکات پیش کئے گئے ہیں، جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، ان میں بعض بالکل نئے اور سید صاحب کے ذاتی اجتہاد و فکر سے تعلق رکھتے ہیں، ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ چونکہ "اخلاق" کا تعلق عمل سے ہے، اس لئے جہاں تک ممکن ہوا ہے قولی حدیثوں کے ساتھ ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فعلی حدیثیں یعنی عملی نمونوں کو بھی درج کرتے چلے گئے ہیں، حسب دستور اس کتاب میں بھی سید صاحب نے بقدر ضرورت اخلاقیات (اتھکس) کے بعض عصری مسائل کا بھی ذکر فرمایا ہے، اور ان کی جو صحیح تنقید کی ہے، اور اسلامی تعلیمات سے ان کا جو تعلق ہے، اس کو جس طرح بیان فرمایا ہے وہ سید صاحب کا خاص حصہ ہے آئندہ اس کا ذکر آئے گا، مذاہب کے اخلاقی تعلیمات کا مقابلہ بھی اسلامی نظریات سے کیا گیا ہے، خصوصاً عیسائیت اور یہودیت سے توموازنہ کرنے کا حق ادا کر دیا گیا ہے، جستہ جستہ ان دو مذاہب کے سوا دین زرتشتی، بودھ مت، ہندو دھرم کے بھی بعض اصولوں کا ذکر کتاب میں آگیا ہے، لیکن وہ بہت سرسری ہے، پوری کتاب پڑھنے کے بعد

ایک مسلمان پر پہلا اثر یہی ہوتا ہے، کہ خدا نے اسے جس روشنی میں پیدا کیا ہے، بے ساختہ اس کے شکر سے دل معمور ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ عمل کی توفیق بھی لوگوں کو میسر فرمائے، کہ اصل مقصد کم از کم سید صاحب کی اس کتاب کا "پڑھنے" سے زیادہ "کرنا" ہے' واللہ یقول الحق و یھدی السبیل

کتاب کی مجمل فہرست

سیرۃ طیبہ کا یہ حصہ دراصل تعلیمات نبوی کے تیسرے باب یعنی اخلاقی تعلیمات کی ایک مبسوط تفسیر ہے،

سید صاحب نے مضامین کی تقسیم دس بابوں میں فرمائی ہے، پہلا باب تمہیدی ہے جس میں مطلق اخلاق کی تعریف و تحدید کی گئی ہے، دوسرا باب "اسلام اور اخلاقِ حسنہ" کا ہے، اس باب کے ذیل میں تزکیہ، حکمت، حقوقِ عباد کی اہمیت، اسلام کے ارکانِ پنجگانہ اور اخلاق، اخلاق حسنہ اور ایمان، اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ، اخلاقِ حسنہ اور خدا کے نیک بندے ہونے کا شرف، اہلِ ایمان کے اخلاقی اوصاف، اخلاق حسنہ کا درجہ اسلام میں، ایمان کے اوصاف و لوازم، اخلاق حسنہ صفاتِ الٰہی کے پرتو ہیں، ان گیارہ عنوانوں پر سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں،

تیسرا باب "اخلاقی معلموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز" ہے' اس کے تحت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی زندگی کے نمایاں خط و خال کو حسب ذیل مباحث کے ذریعہ سے ابھارنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، کتاب کا یہ حصہ از حد قیمتی ہے، اس سلسلہ میں بے پردہ زندگی، قول کے ساتھ عمل کامل اور مکمل (یعنی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ اخلاق کے بہترین نمونہ تھے' اور اسی طرح دوسروں کی اخلاقی تکمیل کے جو کارنامے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں نظائر و امثال کی روشنی میں ان کو واضح کیا گیا ہے) اخلاقی تعلیم کا تنوع (یعنی انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے اخلاقی امور کا جو تعلق ہے، ہر شعبہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نے بہترین نمونے یادگار چھوڑے ہیں، اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی اہم ترین خصوصیت ہے)

چوتھا باب، "اسلام کا فلسفۂ اخلاق" ہے، اس باب کے نیچے حسب ذیل عنوانوں پر بحث کی گئی ہے، بے غرضی، نیت، جدید فلسفۂ اخلاق کی تائید، اخلاق کے لئے ایمان کی شرط، غرض و غایت، ضمیر کی آواز، مسرت و انبساط، رضائے الٰہی، مذاہب میں اخلاق کا بنیادی اصول، خوف و رجا، اخلاق و رہبانیت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اس کے چند شرائط، تجسس و غیبت کی ممانعت، توسط و اعتدال، عدل و احسان، قانون اور اخلاق، عفو و انتقام، عفو و درگذر کی تعلیم، برائی کی جگہ نیکی،

پانچواں باب، "اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ" ہے، سید صاحب نے اپنے علمی تبحر کا ثبوت ان مضامین کی تشریح میں پیش فرمایا ہو،

تفصیل اور ہمہ گیری، اخلاقی تعلیمات کا احاطہ، توراۃ کے اخلاقی احکام، انجیل کے اخلاقی احکام، اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا، قرآنی اخلاق کی فہرست (غالبًا یہ پہلی فہرست ہے جس کا انتخاب انتہائی ژرف نگاہی اور وقت رسی کے ساتھ اس کتاب میں پہلی دفعہ کیا گیا ہے) احادیث کے اخلاقیات کی فہرست (یہ فہرست بھی علمی دنیا کی پہلی چیز ہے) اخلاقی جزئیات کا استقصا، مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ، سود کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ، رشوت کی حرمت میں استقصا، مسیحی اخلاق کی کمزوری، نیٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر، اسلامی اخلاق کا اعتدال، نفوس کا اختلاف استعداد، ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح، قوتِ غضب اور قوتِ شہوت میں تعدیل، مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق، مسیحی اخلاق کی کمزوریاں، لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر، اسلام اور بلند اخلاق، تقدیر، توکل، صبر و شکر، اپنے دشمنوں کو پیار کرو، کفار و مشرکین سے عدم موالات، سختی کا جائز موقع، خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی، اسلام میں کسی سے دائمی اور موروثی نفرت کی تعلیم نہیں، ترک ہوی اخلاق اور محبت الٰہی،

یہ انتیس عنوانات واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا نچوڑ ہیں، قدیم و جدید معلومات کی روشنی میں ہر بحث کو فیصلہ کن طریقہ سے سید صاحب نے ختم فرمایا ہے،

چھٹا باب "تعلیم اخلاق کے طریقے اور اسلوب" تقریباً دس صفحوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معلمانہ شان کو خاص پیرایہ میں بے نقاب کیا گیا ہے، اس کے بعد ساتواں باب ہے جس میں اخلاقی تعلیمات کی مختلف اقسام کی تفصیل کی گئی ہے، حقوق و فرائض کے باہمی امتیازات، فضائلِ اخلاق و رذائل کی کلی تقسیم، آداب جو اخلاق ہی کے ذیل کی چیز ہے، اس پر ایک اجمالی بحث کی گئی ہے،

ساتواں باب گذشتہ بالا عنوانوں میں پہلے عنوان یعنی حقوق و فرائض کی تفصیل پر مشتمل ہے، اس کے ذیل میں حقوق کے معنی، حقوق کی وسعت، حقوق کی ترتیب، والدین کا حق، اولاد کا حق، اصولی تعلیم، اولاد کشی کا انسداد، رضاعت و حضانت، یعنی شیر خوارگی اور بچوں کی پرورش کے متعلق جو حقوق پیدا ہوتے ہیں، تعلیم و تربیت، حقوقِ زوجین، مرد کو کس عورت کے مارنے کا حکم دیا گیا ہے، اہلِ قرابت کے حقوق، ہمسایہ کے حقوق، یتیموں کے حقوق، بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک، حاجت مندوں کے حقوق، بیمار کے حقوق، غلاموں کے حقوق، مہمان کے حقوق، مسلمانوں کے باہمی حقوق، انسانی برادری کا حق، جانوروں کے حقوق (اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے حقوق کی کتنی نئی قسمیں پیدا کی ہیں، سید صاحب درمیان میں بتاتے چلے گئے ہیں، کہ ان حقوق میں سے ایجاد کا سہرا اسلام کے سر کن حقوق کے متعلق تاریخی طور پر بندھا ہوا نظر آتا ہے)

آٹھواں باب "فضائل اخلاق" کی تفسیر و تفصیل کے لئے مخصوص ہے، انتہائی کاوش کے ساتھ ان کی ایک مفصل فہرست تیار کی گئی ہے، اور ہر عنوان کے تحت میں مباحث کا ایک قیمتی ذخیرہ قرآن و سنت سے اخذ کر کے جمع کیا گیا ہے، بہرحال اس باب میں حسب ذیل مضامین پر بحث کی گئی ہے، فضائل کی مختصر فہرست، صدق، زبان کی سچائی، دل کی سچائی، عمل کی سچائی، سخاوت، عفت و پاکبازی، دیانتداری و امانت، شرم و حیا، رحم، عدل و انصاف، عہد کی پابندی، احسان، عفو و درگذر، حلم و بردباری، رفق و لطف، تواضع و خاکساری، خوش کلامی، ایثار، اعتدال و میانہ روی، خودداری و عزتِ نفس، شجاعت و بہادری

تعداد کی قلت و کثرت، موت کا وقت مقرر، شہادت و غزا کا رتبہ، استقامت، حق گوئی، استغنار، ان میں ہر بحث کے متعلق قرآن کی تمام آیتیں، اور صحیح حدیثیں ان کی محققانہ تشریحات کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں)

نواں باب "رذائل" کا ہے، اس کے ذیل میں گذشتہ بالا ملکات وصفات کے مقابل اوصاف اور ان کے سوا بھی دوسرے جذبات و عواطف جن کی اسلام مذمت کرتا ہے تفصیل کی گئی ہے عنوانات حسب ذیل ہیں،

رذائل کے معنی، رذائل کے قرآنی نام، فحشا، منکر اور بغی، فحشار کے معنی، منکر کے معنی، بغی کے معنی، اخلاقِ ذمیمہ برے کیوں ہیں، رذائل کی ترتیب، جھوٹ، جھوٹی قسمیں کھانا، وعدہ خلافی، خیانت و بد دیانتی، غداری و دغابازی، بہتان، چغل خوری، غیبت و بدگوئی، دورخاپن، بدگمانی، مداحی و خوشامد، بخل، حرص و طمع، بے ایمانی، چوری، ناپ تول کی کمی، چھپا کر لینا، رشوت، سود خواری، شراب خواری، غیظ و غضب، بغض و کینہ، ظلم، فخر و غرور، ریار، خود بینی و خود نمائی، فضول خرچی، حسد، فحش گوئی، رذائل پر مختصر تبصرہ،

دراصل اخلاقی ابواب ان ہی نو بابوں پر ختم ہو جاتے ہیں، لیکن "تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ" کی تکمیل کے لئے قدرت نے سید صاحب کے سامنے اخلاق ہی کے ذیل کی ایک اور چیز جسے اسلامی زبان میں "آداب" اور موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں "اٹی کیٹ" کہتے ہیں،

دسواں باب "آداب" کا ہے، پچاس صفحات سے زائد پر اس کی تفصیل کی گئی ہے،

آداب کی اسلامی تشریح کے بعد جو عنوانات اس باب کے نیچے مندرج ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے، فطری آداب، طہارت اور اس کے آداب، کھانے پینے کے آداب، آدابِ مجلس، آدابِ ملاقات، آدابِ گفتگو، باہر نکلنے اور چلنے پھرنے کے آداب، آدابِ سفر، آدابِ خواب، آدابِ لباس، آدابِ مسرت، آدابِ ماتم، متفرق آداب، آداب کا فلسفہ،

الغرض "اسلامیات" کے یہ اہم مباحث جن کی تعداد تقریباً ڈیڑھ سو سے اوپر ہوگی، خالص قرآن، اور صحیح روایتوں کی روشنی میں عہد حاضر کی عصری ذہنیتوں کی مطابق تعبیروں میں پیش کرنا، سید صاحب کا ایک ایسا کارنامہ ہے کہ اگر ان کا قلم ان کے سوا اور کچھ نہ لکھتا، تو صرف یہی مباحث ان کی علمی جلالت شان کے لئے کافی ہو سکتے ہیں، کاش! "سخن گسترانِ پیشیں" میں محویت انسانی فطرت کا عارضہ نہ ہوتا تو جن خدمات کی بدولت پہلوں کو امامت کا مقام عطا کیا گیا ہے محض "در زمانۂ تست" کے عیب کی وجہ سے سید صاحب اس سے محروم نہ قرار پا سکتے تھے، لیکن بہرحال اگر اس کی قیمت آج دنیا میں ان کو نہیں ملی ہے، تو مجھے امید ہے کہ جہاں ہر کام کی حقیقی قیمت ادا کرنے کا بازار قائم ہوگا، سید صاحب انشاء اللہ تعالیٰ وہاں محروم نہ رہیں گے، وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ، تو پھر اس مردہ گھر میں زندہ کاموں کی مزدوری کیوں تلاش کی جائے،

اتنے مبسوط و مفصل اہم مضامین پر تفصیلی تبصرہ گویا ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کر لے گا، اس لئے کل پر تو نہیں، بلکہ کتاب کے بعض اہم اور کلیاتی مباحث کے متعلق کم از کم پڑھنے کے بعد جو جذبات میرے دل میں پیدا ہوئے ان کا اظہار آیندہ اوراق میں کرنا چاہتا ہوں، وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْق،

سیرۃ النبی جلد ششم

یہ اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے، اس میں پہلے اسلام میں اخلاق کی اہمیت بتائی گئی ہے، اور پھر اسلامی اخلاقی تعلیمات اور فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی معلم کی حیثیت سے بھی رسول اسلام علیہ السلام کا پایہ کتنا اونچا ہے،

ضخامت ۷۱۲ صفحے، قیمت: قسم اول صہ، قسم دوم للعہ

"منیجر"

مشرقی اور سمتِ قبلہ

از

مولانا محمد ظفر الدین صاحب قادری رضوی، استاذ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ

علمی حلقہ میں جناب عنایت اللہ صاحب مشرقی کا تعارف سب سے پہلے ان کی تصنیف تذکرہ کے ذریعہ سے ہوا تھا، اب ان کی تحریکِ خاکساریت نے ان کی شہرت عام کر دی ہے، وہ یورپ کی درجنوں ڈگریوں کے مالک اور مختلف فنون میں علم و کمال کے مدعی ہیں، اسے دیکھ کر یہ خیال تھا کہ مذہب کے متعلق ان کے معلومات و خیالات کیسے ہی ناقص و غلط ہوں لیکن جدید علوم سے ضرور ان کو واقفیت ہوگی، لیکن ان کے بعض علمی مضامین کو دیکھ کر یہ حسنِ ظن بھی غلط ثابت ہوا، عرصہ ہوا انھوں نے علم ہیئت کی رو سے ہندوستان کی مسجدوں کی سمتِ قبلہ کے غلط ہونے پر ایک مضمون لکھا تھا، اس کے علاوہ وہ "مولویوں کی جہالت" کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً جن عالمانہ خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید علوم میں بھی ان کا پایہ مذہبی علوم سے کم نہیں ہے، اس مضمون میں ریاضی و ہیئت اور تاریخِ علوم میں ان کے علمی کمالات پر تبصرہ مقصود ہے، مولویوں کی جہالت کے سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں،

"آپ کی بلا جانتی ہے کہ مکہ کا رخ دریافت کرنا کسے کہتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ جغرافیہ کس بیل کا نام ہے، علم نجوم کسے کہتے ہیں، دوربین کیا ہوتی ہے، خط سرطان کس مرض کو کہتے ہیں، آپ صرف اپنی رات کی باسی روٹیاں گن کر بیچنا نہیں جانتے اور اگر روٹیاں

زیادہ ہوں اور آنے پورے نہ بیٹھیں تو حساب میں گھنٹوں غلطی نہیں کرتے، بلکہ آنوں کو ان روٹیوں پر بٹھا لیتے ہیں، آپ کو اس کا پتہ ہے کہ مغرب اور شمال کے دو طرفوں کے درمیان خود مسلمانوں ہی نے ۹۰ درجے قائم کئے تھے، ہر درجے کو ساٹھ دقیقہ (منٹ) اور دقیقہ کو ساٹھ ثانیوں (سکنڈ) میں تقسیم کیا تھا"

مشرقی صاحب کی ریاضی واقفیت کا نمونہ

مشرقی صاحب کو اس دعوائے ہمہ دانی کے باوجود یہ بھی نہیں معلوم کہ مسلمانوں سے بہت پہلے یونانیوں نے اس فن کو مرتب کیا تھا، بطلیموس کی کتاب "مجسطی" اس فن میں معروف و مشہور ہے اس بارے میں آپ بھی اور ملاؤں کے نقشِ قدم نکلے، مغرب اور شمال کے دو طرفوں کے درمیان تخصیص بھی عجیب ہے، کیا مغرب اور جنوب کے دو طرفوں کے درمیان ۹۰ سے کم یا زیادہ درجے قائم کئے تھے یا اس کے درجوں کو ساٹھ دقیقوں سے کم و بیش پر تقسیم کیا تھا اور پھر ان دقیقوں کی ساٹھ ثانیہ (سکنڈوں) سے کم و بیش پر قسمت کی تھی، علیٰ ہذا القیاس نقطہ شمال و مشرق کے دو طرفوں اور نقطۂ مشرق و جنوب کے دو طرفوں کو کے درجوں اور ان درجوں کو کتنے دقیقہ و ثانیہ پر تقسیم کیا، جب اس فن میں ہر دائرہ ۳۶۰ درجہ پر منقسم ہے، تو ہر ربع ۹۰ درجہ ہوا، خواہ وہ نقطہ مغرب و شمال کے درمیان ہو یا نقطہ شمال و مشرق کے درمیان، نقطہ مشرق و جنوب کے درمیان ہو یا نقطہ جنوب و مغرب کے درمیان، کسی دو نقطوں کے درمیان جس کا فصل ربع دور ہو لا محالہ ۹۰ درجہ ہوگا، اور ہر درجہ ۶۰ دقیقہ اور ہر دقیقہ ۶۰ ثانیہ اور ہر ثانیہ ۶۰ ثالثہ اور ہر ثالثہ ۶۰ رابعہ اور ہر رابعہ ۶۰ خامسہ اور ہر خامسہ ۶۰ سادسہ اور ہر سادسہ ۶۰ سابعہ اور ہر سابعہ ۶۰ ثامنہ اور ہر ثامنہ ۶۰ تاسعہ اور ہر تاسعہ ۶۰ عاشرہ پر منقسم ہوتا ہے، اس لئے یہ تخصیص بالکل غلط اور بے معنی ہے،

ایک اور نادر تحقیق

مشرقی صاحب فرماتے ہیں،

"مغرب اور شمال کی دو سمتوں میں تین لاکھ چوبیس ہزار مختلف طرفین مسلمانوں نے خود اسی قرآن کی تعلیم کو صحیح سمجھ کر قائم کی تھیں"۔

کیا فن کا حساب ثانیہ ہی تک محدود ہے، جو تین لاکھ چوبیس ہزار سمتیں ہوں گی، اس کا حساب تو درحقیقت عاشرہ سے بھی متجاوز ہے، اگر عاشرہ ہی تک مانا جائے جب بھی ہر ربع کی دو سمتوں میں پندرہ سنکھ ستائیس پدم چھبیس نیل چونسٹھ کھرب مختلف سمتیں متعین ہوتی ہیں، ایسی حالت میں ان کو صرف تین لاکھ چوبیس ہزار سمتیں بتانا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، میں مشرقی صاحب کی اس خوش اعتقادی کی ضرور تعریف کروں گا، کہ قرآن شریف خواہ پڑھتے ہوں یا نہ پڑھتے ہوں اور سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں، مگر زبان پر دعویٰ قرآن شریف ہی کا ہے، ربع دائرہ کو ۹۰ حصہ اور ہر حصہ کو ۶۰ دقیقہ اور ہر دقیقہ کو ۶۰ ثانیہ پر تقسیم کو قرآن شریف کی صحیح تعلیم کا نتیجہ بتانا بھی عجیب دعویٰ ہے، کاش مشرقی صاحب نے ان آیتوں کو بھی تحریر فرما دیا ہوتا جن سے مسلمانوں نے یہ حساب قائم کئے کہ اس سے اوروں کو بھی فائدہ پہنچتا آپ کے نزدیک گویا قرآن شریف فقہ و مسائل دینی کے بجائے ہندسہ و ہیئت کی تعلیم کی کتاب ہے، اسی لئے فقہی مسائل جو قرآن شریف سے مستنبط ہوئے ہیں وہ ان کے نزدیک مولوی اور ملا کا بتایا ہوا دین ہے، اور ہیئت و ہندسہ کے مسائل قرآن کی تعلیم ہیں ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ایک دعویٰ میں چار غلطیاں

آپ نے اپنے ایک دعویٰ میں چار غلطیاں کیں، (۱) مغرب شمال کے دو طرفوں میں ۹۰ درجہ مسلمانوں کا قائم کرنا (۲) مغرب و شمال دو سمتوں کی تخصیص، (۳) ان دو سمتوں کے درمیان تین لاکھ چوبیس ہزار سمت بتانا (۴) اس تقسیم کو قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ظاہر کرنا۔

ایک اور غلطی

پھر کہتے ہیں،

"اسی مغرب اور شمال کی سمتوں کے درمیان صرف ایک درجہ ۱/۹ حصہ پھر جانے سے

دو ہزار تین سو میل کی دوری پر پورے چالیس میل کا فرق پڑ جاتا ہے"

یہاں بھی مغرب و شمال کی تخصیص بے معنی ہے، جن لوگوں کا سمت قبلہ منحرف بہ جنوب ہے، ان میں جو لوگ مکہ معظمہ سے دو ہزار تین سو میل کی دوری پر ہیں وہ اگر ایک درجہ صحیح سمت سے پھر جائیں تو کیا ان لوگوں کو چالیس میل کا فرق نہ پڑے گا، اسی طرح جو لوگ مکہ معظمہ سے پچھم ہیں اور ان کا سمتِ قبلہ نقطۂ مشرق سے منحرف بہ شمال یا جنوب ہے، وہ اگر دو ہزار تین سو میل کی دوری پر ہوں اور سمت قبلہ سے ایک درجہ پھر جائیں تو ان لوگوں کو بھی صحیح سمت سے چالیس میل کا فرق ہوگا یا نہیں، اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے اور اگر ہوگا تو تخصیص غلط اور بے معنی ہوئی، پھر مکہ معظمہ سے لاہور کا فصل دو ہزار تین سو میل بتانا بھی صحیح نہیں، اس لئے کہ فصل طول جـ قو ہے، اگر بالفرض اسے صحیح مان لیا جائے جب بھی ایک درجہ پر چالیس میل کا فرق بتانا غلط ہے ورنہ ۶۰ درجہ کے زاویہ پر جہاں مثلث متساوی الاضلاع ہوتا ہے اور شکل ترسیمی نمودار ہوتی ہے (جس جگہ کرۂ عالم پر کھڑے ہونے والے دو متساوی القد انسانوں کے سروں کا فاصلہ قدموں کے فاصلہ سے بقدر ایک قامت زائد ہوتا ہے جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہے) وتر اسی قدر ہونا چاہئے، حالانکہ اس حساب سے وتر دو ہزار چار سو میل ہوتا ہے،

مکہ سے سورت کی سمت کی تعیین میں غلطی فرماتے ہیں:

"مکہ معظمہ سے سورت جہاں عرب پہلی صدی میں سب سے پہلے اترے تھے ٹھیک مشرق کی طرف تھا"

یہ بھی محض رجماً بالغیب اور بالکل غلط، مکہ معظمہ کا عرض کا قم ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ ہے اور سورت کا عرض کا کا ۲۱ درجہ ۱۲ دقیقہ ہے الخ ۲۸ دقیقہ کا فرق ہے اور مکہ معظمہ کا طول م یح یعنی ۴۰ درجہ ۱۳ دقیقہ اور سورت کا ع ح ہ یعنی ۷۰ درجہ ۵ دقیقہ ہے ما بین الطولین لب نقے اس حساب سے دونوں شہروں میں

شرقی غربی فرق دو ہزار ایک سو ستاسی میل ہوا، اتنی دوری پر ۲۸ دقیقہ یعنی تقریباً نصف درجہ فرق ہونے سے مشرقی صاحب ہی کے حساب سے سمت قبلہ میں ۱۹ میل کا فرق ہو جائے گا، پھر ٹھیک مشرق کہاں ہوا کہ سمت قبلہ ان کے خیال کے مطابق ٹھیک نقطہ مغرب ہو،

تاریخی غلطی مشرقی صاحب فرماتے ہیں کہ

"عرب جیسی جاہل اور اجڈ قوم چند برسوں کے اندر اندر دو ہزار میل دور مقام کی صحیح سمت دریافت کر سکی، حالانکہ اس وقت جغرافیہ کا نام و نشان موجود نہ تھا اور نہ سطح زمین پر طول بلد و عرض بلد کے خطوط کو کوئی متنفس جانتا تھا"

بیخبری بھی کیا چیز ہے، اس کے طفیل میں انسان جو جی میں آئے کہہ دے کوئی ذمہ داری نہیں، پڑھا لکھا آدمی ایسی بات لکھنی درکنار اسے بولتے بلکہ تصور کرتے شرمائے گا،

علم جغرافیہ کب وجود میں آیا، موجد کون ہے؟ طول بلد و عرض بلد کے خطوط اسلام سے کتنے پہلے کھینچے گئے، ان کے لئے کشف الظنون اور دائرۃ المعارف دیکھئے، صاحب کشف الظنون علم جغرافیہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

هو علم يعرف منه احوال الاقاليم	علم جغرافیہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ کرۂ ارض
السبعة الواقعة في الربع المسكون	کے ربع مسکون کی ساتوں اقلیموں کے حالات
من كرة الارض وعروض البلدان	اور ان کی آبادیوں کے عرض البلد اور
الواقعة فيها واطوالها وعدد	طول البلد، ان کے شہروں، ان کے پہاڑوں
مدنها وجبالها وبراريها	ان کی خشکی، ان کے دریاؤں، ان کی نہروں
وبحورها وانهارها الى ذلك	وغیرہ ربع مسکون کے حالات معلوم ہوتے
من احوال الربع. واول من	ہیں، اس فن میں سب سے پہلے بطلیموس قلوذی

صنف فیہ بطلیموس القلوذی	نے تصنیف کی المجسطی کے بعد اس نے
فانہ صنف کتابہ المعروف	اس فن پر ایک کتاب لکھی جو جغرافیہ
بجغرافیا ایضاً بعد ما صنف المجسطی	کے نام سے مشہور ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے فن جغرافیہ پر جس میں طول و عرض بلد وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے، سب سے پہلے بطلیموس نے کتاب لکھی، جس کا زمانہ دوسری صدی عیسوی ہے، دائرۃ المعارف میں ہے:

بطلیموس کلودیوس ریاضی فلکی	بطلیموس کلودیوس عالم ریاضی فلکی جغرافی
جغرافی یونانی مصری یقال	یونانی مصری دوسری صدی عیسوی میں
انہ ولد فی بیلوسوم ونشأ	بیلوسوم میں پیدا ہوا، اور اسکندریہ میں
فی الاسکندریۃ فی القرن الثانی المیلادی	نشو ونما حاصل کی،

اس سے معلوم ہوا کہ بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں پیدا ہوا، جبکہ مشرقی صاحب کے خیال کے مطابق جغرافیہ کا نام و نشان نہ تھا، اور سطح زمین پر طول بلد، عرض بلد کا کوئی جاننے والا نہ تھا، رہا عربوں کا صحیح سمت دریافت کرلینا، اگر درحقیقت سورت کی مسجدیں عربوں کی بنائی ہوئی ہیں یا اسی بنیاد پر ہیں، بالکل صحیح سمت قبلہ کی طرف ہیں تو محض نور اسلام کی وجہ سے ہے، ورنہ اگر ٹھیک نقطۂ مغرب کو ہیں تو ان کے قاعدہ سے ۱۹ میل خانہ کعبہ سے منحرف ہیں،

سمت قبلہ کی تعیین کا مشہور طریقہ

آگے چل کر مشرقی صاحب فرماتے ہیں،

"میں نے ایک شخص کو لاہور کے ملاؤں اور معماروں کے پاس بھیجا کہ وہ مسجد بناتے وقت قبلہ کا رخ کیوں کر مقرر کرتے ہیں، ایک بڑی عمر کے جاہل نے کہا واہ جی یہ تو بہت آسان ہے، قطب تارے کی طرف ہاتھ پھیلا کر اور کندھے کی طرف دیکھ کر کھڑے ہوگئے تو ناک کی سیدھ میں قبلہ ہے، خیر میں سمجھ گیا کہ ملا کی نجوم دانی کس قدر

بے خطا ہے اور اس کا مطلب یہی ہے جو آپ کہتے ہیں کہ شمالی ہندوستان کا قبلہ مغرب ہی کی طرف ہے"

اس سے ظاہر ہوا کہ مشرقی صاحب کی ساری پرواز اور ہندوستان کی مسجدوں کے سمت قبلہ سے انحراف کی ساری عمارت انھوں نے کسی ملا کے بیان پر قائم کی ہے، اور اسے غایت دیانت سے تمام مولویوں کی جہالت کے سر منڈھ دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ وہ اس ملا یا اس جاہل معمار کی موٹی بات کو بھی نہ سمجھ سکے، اگر وہ اس کے الفاظ پر غور فرماتے تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا کہ ہندوستان کے شہروں کی سمت قبلہ تین طرح کی ہے، بعض کا قبلہ ٹھیک نقطۂ مغرب بلا انحراف نقطۂ شمال یا جنوب ہے اور بعض کا منحرف بہ شمال، اور بعض کا منحرف بہ جنوب اور ان سب کی پہچان قطب تارہ ہے جہاں کا قبلہ ٹھیک نقطۂ مغرب ہے، وہاں مرکز قطب کو مونڈھے کی ہڈی کے مرکز کے سیدھ میں رکھنا ہوتا ہے اور جس جگہ کا قبلہ منحرف بہ شمال ہے وہاں قطب تارہ کو مونڈھے کے اگلے حصہ کی طرف کرنا ہوتا ہے اور جہاں کا قبلہ منحرف بہ جنوب ہو وہاں قطب تارہ کو مونڈھے کی پشت پر رکھنا ہوتا ہے مگر جسے اس کا علم ہی نہ ہو اور اس تفصیل سے ناواقف ہو تو وہ لامحالہ اپنی جہالت کا الزام دوسرے کے سر تھوپیگا،

امام رازی کا طریق تعیین سمت قبلہ

امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں،

المسئلۃ الرابعۃ فی دلائل القبلۃ	چوتھا مسئلہ دلائل قبلہ کے بیان میں ہے
اعلم ان الدلائل اما ارضیۃ	دلائل قبلہ تین قسم کے ہیں، ارضی، ہوائی، سماوی،
او ہوائیۃ او سماویۃ اما الارضیۃ	ارضی اور ہوائی کا کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے،
والہوائیۃ فہی غیر مضبوطۃ	سماوی دلیلیں دو قسم کی ہیں تقریبی تحقیقی،
ضبطاً کلیاً اما السماویۃ فادلتہا	تقریبی بھی دو طرح کی ہیں، نہاری اور لیلی،
منہا تقریبیۃ ومنہا تحقیقیۃ	نہاری تو آفتاب ہے اور لیلی یہ ہے کہ سمت

اما التقريبية فقد قالوا هذه الادلة اما ان تكون نهارية او ليلية اما النهارية فالشمس واما الليلية فهو ان يستدل على القبلة بالكوكب الذي يقال له الجدي فانه كوكب كالثابت لا تظهر حركته من موضعه واما التحقيقية فهي الوجوه المذكورة في كتب الهيئة اهـ مختصراً

قبلہ پر اس کوکب سے استدلال کیا جائے جیسے جدی الفرقد کہتے ہیں، اس لئے کہ یہ کوکب اگرچہ حرکت کرتا ہے مگر اتنی کم کہ بمنزلہ ثابت کے ہے، اس کی حرکت ظاہر نہیں ہوتی اور تحقیقی دلائل وہ وجوہ ہیں جو ہیئت کی کتابوں میں مذکور ہیں اھ مختصراً

نجوم اور ہیئت کیا ایک ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ کوکب جدی الفرقد یعنی قطب تارہ سے استدلال صرف لاہور کے بڑی عمر کے جاہل کی جدت نہیں بلکہ اکابر علمائے کرام امام فخر الدین رازی جیسے مشہور و مستند عالم دینی کی تحقیق ہے، بالفرض اگر جاہل ملا کا یہ جواب غلط بھی مان لیا جائے تو اس سے اس کی نجوم دانی سے ناواقفیت کا حکم کس طرح مشرقی صاحب نے لگا دیا، کیا ان کے نزدیک علم ہیئت اور علم نجوم دونوں ایک چیزیں ہیں، کہ ایک کی ناواقفیت سے دوسرے کی ناواقفیت لازم آتی ہے، حالانکہ ادنیٰ پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ علم ہیئت افلاک کی حرکات اور کواکب کے اوضاع و اطوار سے بحث کرتا ہے اور علم نجوم میں ان اوضاع و حرکات کے آثار سے بحث ہوتی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی صاحب علم ہیئت و نجوم کے فرق سے بھی واقف نہیں، پھر اس غلط جواب سے یہ نتیجہ کہاں سے نکالا کہ "شمالی ہندوستان کا قبلہ مغرب ہی کی طرف ہے"،

ایک ملا کے نہ جاننے سے تمام شمالی ہندوستان کا قبلہ مغرب کی سمت کس طرح ہو گیا، کیا شمالی ہندوستان کی تمام مسجدیں آپ کے بڑی عمر والے جاہل ہی کی رائے اور نقشہ سے بنی ہیں،

بے بنیاد دعوے

اس کے بعد آپ کے قیمتی افادات یہ ہیں،

"نقشہ کے موٹے خط ا ب سے معلوم ہوگا کہ لاہور کی مسجدوں کا رخ صحیح رخ سے قریباً ۲۵ درجے جنوب کی طرف ہٹا ہے، ایک درجہ کا فرق دو ہزار تین سو میل پر میں نے ابھی چالیس میل بتایا ہے تو اس حساب سے ۲۵ درجوں کا فرق ۲۵ × ۴۰ یعنی ایک ہزار میل ٹھہرا"

یہ دونوں باتیں بالکل غلط ہیں، اگر یہ بیان صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے کہ لاہور کی تمام مسجدیں نقطہ مغرب کو ہیں، حالانکہ نقطہ مغرب سے منحرف بہ جنوب ہونا چاہئے تو لاہور کی مسجدوں کا رخ صحیح رخ سے جتنے درجہ بھی ہو شمال کو ہٹا ہو گا، نہ جنوب کو، پھر اسے ۲۵ درجے جنوب کو ہٹا ہوا بتانا بھی غلط ہے، لیکن اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو بیت المقدس کی سمت میں نہ ہونگی بلکہ اس شہر کی سمت میں ہونگی جو لاہور سے جنوب کی طرف واقع ہو گا،

ایک ہزار میل کا فرق بتانا بھی غلط اور بنا، فاسد علی الفاسد ہے، لاہور کی مسجدوں کا رخ اگر ٹھیک نقطہ مغرب مان لیا جائے تب بھی مشرقی صاحب کے اصول کے مطابق جو صرف عرض البلد کا اعتبار کرتے ہیں، اور اسی بنا پر وہ ہندوستان میں سورت، ناگپور، کٹک وغیرہ کا قبلہ جو ان کے خیال میں عرض البلد مکہ معظمہ پر واقع ہیں، نقطہ مغرب صحیح خیال کرتے ہیں بالکل غلط ہے، سمت قبلہ جاننے کے لئے صرف عرض البلد کافی نہیں، اس کے ساتھ طول البلد کا معلوم کرنا بھی ضروری ہے، کہ طول البلد ہی سے عرض موقع معلوم ہوتا ہے جس سے سمت اطراف پہچانی جاتی ہے، مشرقی صاحب چونکہ صرف عرض البلد کا لحاظ کرتے ہیں اس لئے گذارش ہے کہ لاہور کا عرض البلد لا ل ہے، یعنی ۳۱ درجہ ۳۰ دقیقہ اور مکہ معظمہ کا کا م یعنی ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ مابین العرضین ط ن ۹ درجہ ۵۰ دقیقہ ہے، اس حساب سے پچیس درجہ کا فرق بتانا بالکل بے اصل اور غلط ہے، کیا ۳۱ سے ۲۱ کے تفریق کرنے سے ۲۵ بچتے ہیں، جب یہ فرق ہی غلط ٹھہرا تو چالیس میں ضرب دے کر ہزار میل کا فرق بتانا بھی غلط ہوا صحیح تین سو ترانوے میل ہے،

سب سے بڑی غلطی مشرقی صاحب کی یہ ہے کہ انھوں نے جواب دینے سے قبل لاہور کی مسجدوں

کو خود نہیں جانچا صرف مستفتی کے کہنے پر ایمان لے آئے، کاش اس شخص کو لاہور کے ملاؤں اور معماروں کے پاس بھیجنے کے بجائے آپ خود اس کی تحقیق کر لیتے تو اتنی ٹھوکریں نہ کھاتے، یا کسی ایسے شخص کو بھیجتے جو یہ معلوم کر سکتا کہ کون کون مسجدیں ٹھیک قبلہ کی سمت ہیں اور کون کون کس قدر اور کس جانب منحرف ہیں تو بھی غلطیوں میں مبتلا نہ ہوتے، لیکن یہ ہوتا کیونکر، مشرقی صاحب کو خود ہی نہیں معلوم کہ سمت قبلہ کے معلوم کرنے کا کیا قاعدہ ہے، اور مسجدوں کی صحت اور غلطی معلوم کرنے کا کیا اصول ہے،

غلط سمتیں | آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں،

"اس نقشہ سے صاف ظاہر ہے کہ تمام ہندستان میں ماسوا سورت، ناگپور، کٹک وغیرہ کے جو اسی عرض البلد پر واقع ہیں، جس پر کہ مکہ معظمہ ہے ہندستان کی تمام نئی مسجدوں کا قبلہ غلط ہے، ایک مسجد ایسی نہیں جس کے نمازیوں نے آج تک ایک نماز قبلہ رو ہو کر پڑھی ہو، لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس ہے، راولپنڈی والوں کا بغداد اور دمشق، پشاور والوں کا بیروت، دہلی والوں کا بوشہر، ملتان کا کوفہ، کراچی والوں کا مدینہ، مدراس والوں کا عدن، بمبئی والوں کا بندرگاہ سواکن وغیرہ وغیرہ"

یہ آپکے معلومات کا نچوڑ ہے، جس کا ایک نقطہ بھی صحیح نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سرے سے سمت قبلہ کے معنی ہی سے ناواقف ہیں اور نہ آپ کو اس کے جاننے کا اصول معلوم ہے، آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ نمازی کا منہ نماز میں جس سمت کو ہو جائے وہی سمت قبلہ ہے اسی سے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس، راولپنڈی والوں کا بغداد اور دمشق ہے، اول تو دو شہروں کا جو طول وعرض میں مختلف ہیں ایک قبلہ یعنی بیت المقدس بتانا بالکل غلط ہے، جب دو شہر طول و عرض دونوں میں مختلف ہوں گے تو ان کا قبلہ بھی مختلف ہوگا، ایک ہرگز نہیں ہو سکتا، اس سے بھی بڑھ کر پُر لطف بات راولپنڈی کا قبلہ بغداد اور دمشق کو بتانا ہے، جو طول وعرض دونوں میں

مختلف ہیں، کوئی ایسے دو شہر جو طول وعرض دونوں میں مختلف ہوں ایک شہر کا قبلہ ہرگز نہیں ہو سکتے

یہ بھی غنیمت ہے کہ راولپنڈی کا قبلہ آپ نے صرف دو ہی شہروں بغداد اور دمشق ہی کو بتایا ورنہ آپکے عامیانہ اصول پر تو مصلی کے سامنے جتنے شہر، درخت، مکان، پہاڑ، مندر، گرجا، وغیرہ واقع ہوں وہ سب اس کے قبلہ ہیں، ورنہ تخصیص بلا تخصص لازم آئے گی،

سطحی نقشہ سے تعیین سمت کی سطحی غلطی | سمت قبلہ میں مشرقی صاحب کی غایت معلومات یہ ہیں کہ

"نقشہ اصلاح یا اس سے بہتر صحیح نقشہ یعنی اسکولوں کا نکالو اور جس شہر کا سمت قبلہ معلوم کرنا چاہتے ہو اس شہر اور مکہ معظمہ کے درمیان خط کھینچ کر جو سمت معلوم ہو ٹیڑھا یا سیدھا جس طرح کا خط ہو اسی طرح راست یا کج سمت قبلہ ہے"،

مشرقی صاحب نے اسے اپنے رسالہ "مولوی کا غلط مذہب نمبر ۹" کے نقشہ میں خط اَب جَ دے کر سمجھایا ہے، شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ ان کے رسالہ یا اخبار اصلاح کا نقشہ تو در کنار بڑے بڑے نقشوں میں سینکڑوں کیا ہزاروں لاکھوں بلکہ کروروں جگہیں دنیا بلکہ ہندستان کی ایسی ہیں جن کا نام ونشان تک نہیں، اس کے لئے ساری دنیا کا نقشہ نہ سہی ہندوستان کے لئے کم از کم ایشیا کا نقشہ ضرور ہونا چاہئے جس میں ایک طرف تو وہ شہر ہو جس کی سمت مطلوب ہے، دوسری طرف مکہ معظمہ ہے تو جغرافیہ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ایشیا کے نقشہ میں ہندوستان کے سب بڑے بڑے شہر بھی نہیں ہوتے،

سمتوں کی تعیین میں سخت غلطیاں | اس کے بعد مشرقی صاحب نے اپنی خیالی بنیاد پر چند شہروں کی سمت قبلہ بتائی ہے، اس کی واقعی صحت تو الگ رہی خود ان کے خود ساختہ اصول کے مطابق صحیح نہیں ہے، سورت، ناگپور اور کٹک کا قبلہ نقطہ مغرب کو صحیح بتانا بھی غلط ہے،

سورت کے متعلق اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مشرقی صاحب کے قاعدہ سے ۱۹ میل سمت قبلہ سے

فرق ہے، ناگپور کا عرض کا ہ یعنی ۲۱ درجہ ۵ دقیقہ ہے، اور مکہ معظمہ کا عرض کا م یعنی ۲۱ درجہ ۴۰ دقیقہ مابین العرضین لہ یعنی ۳۵ دقیقہ، طول ناگپور عط ہ یعنی ۷۹ درجہ ۵ دقیقہ مابین الطولین لح نب یعنی ۳۸ درجہ ۵۲ دقیقہ، فصل طول ۲ گھنٹہ ۳۵ منٹ ۲۸ سکنڈ، فرق دو ہزار پانچسو چورانوے میل جب آپ کے حساب سے دو ہزار تین سو میل پر ایک درجہ کے فرق سے پورے چالیس میل کا فرق پڑتا ہے تو دو ہزار پانچسو چورانوے میل ۳۵ دقیقہ پر ۲۸ میل کا فرق ہوگا، پھر ٹھیک نقطۂ مغرب کہاں ہوا،

علیٰ ہذا القیاس کٹک کا عرض ک ل ۲۰ درجہ ۳۰ دقیقہ ہے، مابین العرضین ا ی ایک درجہ ۱۰ دقیقہ اور کٹک کا طول فو آ ۸۶ درجہ ایک دقیقہ ہے، مابین الطولین مہ مح ۴۵ درجہ ۴۸ دقیقہ ہے، فصل طول ۳ گھنٹہ ۳ منٹ، فرق مسافت تین ہزار بیالیس میل تو کٹک کا فرق نقطۂ مغرب سے آپ ہی کے حساب سے ۷۰ میل ہوا، پھر کٹک کا سمت قبلہ نقطۂ مغرب بتانا کس طرح صحیح ہوگا،

نیز انھوں نے ہندوستان کے جن جن شہروں کا قبلہ غیر ممالک کے جن جن شہروں کو بتایا ہے وہ جس طرح واقعہ کے خلاف ہے خود ان کے اصول و قاعدہ کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے، اسلئے کہ ان شہروں کے عرض میں بھی فرق ہے اور طول کا فرق اس پر مستزاد ہے،

اگر بالفرض ان شہروں کے مسلمان ٹھیک نقطۂ مغرب کی طرف بھی منھ کر کے نماز پڑھتے ہوں تب بھی سمت قبلہ کی طرف ٹھیک رخ نہ سہی مگر ان شہروں کی طرف بھی (جنھیں مشرقی صاحب نے ان شہروں کا قبلہ بتایا ہے) رخ نہ ہوگا، وہ لاہور اور امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس بتاتے ہیں، اولاً لاہور اور امرتسر دونوں ایک عرض پر نہیں ہیں، لاہور کا عرض البلد ۳۱ درجہ ۳۰ دقیقہ ہے، اور امرتسر کا ۳۱ درجہ ۳۷ دقیقہ ہے، اس حساب سے اگر بیت المقدس لاہور والوں کا قبلہ ہوگا، یعنی ان کے نقطۂ مغرب کے ٹھیک جہت میں ہوگا، تو امرتسر والوں کا قبلہ نہ ہوگا اور اگر امرتسر والوں کا قبلہ ہوگا تو لاہور والوں کا نہ ہوگا، حالانکہ واقعہ کے لحاظ سے بیت المقدس نہ

لاہور والوں کا قبلہ ہے اور نہ امرتسر والوں کا، اس لئے کہ بیت المقدس کا عرض لا م ۳۱ درجہ ۴۰ دقیقہ ہے جس سے لاہور سے پورے دس دقیقہ اور امرتسر سے تین دقیقہ کا فرق ہے، اور بیت المقدس کا طول لہ ید ۳۵ درجہ ۱۴ دقیقہ ہے اور لاہور کا طول عد کج ۷۴ درجہ ۲۳ دقیقہ مابین الطولین لط ط ۳۹ درجہ ۹ دقیقہ، فصل طول دو گھنٹہ ۳۶ منٹ ۳۶ سکنڈ، فرق مسافت دو ہزار چھ سو میل، گویا خود ان کے قاعدہ سے ۷ میل کا فرق ہوا، پھر لاہور والوں کا قبلہ بیت المقدس کس طرح ہوگا؟

علیٰ ہذا القیاس طول امرتسر عد مح ۷۴ درجہ ۴۸ دقیقہ ہے تو بیت المقدس و امرتسر کا مابین الطولین لط لد ۳۹ درجہ ۳۴ دقیقہ اور فصل طول دو گھنٹہ ۳۸ منٹ ۱۶ سکنڈ ہوا، اور فرق مسافت دو ہزار چھ سو تیس میل ہوا، اس لئے مشرقی صاحب کے قاعدہ سے نقطۂ مغرب سے ۲ میل کا فرق ہوگا، پھر امرتسر والوں کا قبلہ بیت المقدس کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے،

اسی طرح راولپنڈی والوں کا قبلہ بھی بغداد نہ ہوگا کیونکہ راولپنڈی کا عرض لہ لز ۳۵ درجہ ۳۷ دقیقہ ہے، اور بغداد کا لج ک ۳۳ درجہ ۲۰ دقیقہ، مابین العرضین ب یز ۲ درجہ ۱۷ دقیقہ اور راولپنڈی کا طول عج و ۷۳ درجہ ۶ دقیقہ ہے اور بغداد کا مد کہ ۴۴ درجہ ۲۵ دقیقہ مابین الطولین کح ما ۲۸ درجہ ۴۱ دقیقہ فصل طول ایک گھنٹہ ۵۴ منٹ ۴۴ سکنڈ فرق مسافت ایک ہزار نوسو سترہ میل یہ فرق اگرچہ طول میں اور شہروں کے اعتبار سے کچھ کم ہے پھر بھی تقریباً دو ہزار میل ہے مگر عرض کا فرق ۲ درجہ ۱۷ دقیقہ ہے، جب ایک درجہ پر آپ کے حساب سے ۴۰ میل کا فرق پڑ جاتا ہے تو دو درجہ سے زائد پر ۹۱ میل فرق ہوگا، پھر راولپنڈی والوں کا قبلہ بغداد کو بتانا کس قدر غلط ہے اور دمشق اور راولپنڈی کا مابین العرضین ب ز ۲ درجہ اور ۷ دقیقہ ہے اور مابین الطولین لو نب ۳۶ درجہ ۵۲ دقیقہ ہے، فصل طول دو گھنٹہ ۲۷ منٹ ۲۸ سکنڈ اور فرق مسافت دو ہزار پانچسو چودہ میل ہے، اس میں بھی ان کے حساب سے ۸۴ میل فرق ہوا، نہ ٹھیک نقطۂ مغرب ہوگا کہ راولپنڈی والوں کا قبلہ دمشق قرار دیا جائے،

پشاور کا قبلہ بیروت بتانا بھی صحیح نہیں اس لئے کہ پشاور کا عرض البلد لد یہ درجہ دقیقہ ۳۴ درجہ ۱۵ دقیقہ ہے اور بیروت کا لجـ نہ ۳۳ درجہ ۵۴ دقیقہ مابین العرضین کا یعنی ۱۲ دقیقہ، طول پشاور عا ل ق ۷۱ درجہ ۳۰ دقیقہ طول بیروت لہ لہ ۳۵ درجہ ۳۱ دقیقہ مابین الطولین لہ نط ۳۵ درجہ ۵۹ دقیقہ فصل طول ۲ گھنٹہ ۲۳ منٹ ۵۶ سکنڈ، فرق مسافت دو ہزار چار سو میل تو ۲۱ درجہ پر ۲۴ میل کا فرق ہوگا، اسی طرح دہلی کا قبلہ بوشہر نہیں ہو سکتا، دہلی کا عرض البلد کح مح ق ۲۸ درجہ ۴۲ دقیقہ ہے بوشہر کا کط ۲۹ درجہ ۵۰ دقیقہ مابین العرضین اح ایک درجہ ۸ دقیقہ طول دہلی عز کہ ۷۷ درجہ ۲۰ دقیقہ طول بوشہر ۵۰ درجہ مابین الطولین کز کہ ۲۷ درجہ ۲۰ دقیقہ، فصل طول ایک گھنٹہ ۴۹ منٹ ۲۰ سکنڈ فرق مسافت ایک ہزار چھ سو بیاسی میل پس ۴۵ میل فرق ہوگا،

یہ بھی صحیح نہیں کہ ملتان کا قبلہ کوفہ ہے کہ ملتان کا عرض ل ج ۳۰ درجہ ۳ دقیقہ کوفہ کا عرض لب مد ۳۲ درجہ ۴۴ دقیقہ ہے مابین العرضین ب ما ۲ درجہ ۴۱ دقیقہ طول ملتان عا ل ق ۷۱ درجہ ۳۰ دقیقہ طول کوفہ کد ۴۴ درجہ مابین الطولین مزل ق ۴۷ درجہ ۳۰ دقیقہ فصل طول ح ی تین گھنٹہ دس منٹ فرق مسافت تین ہزار ایک سو چھیاسٹھ یعنی مشرقی صاحب کے قاعدہ سے ایک سو باسٹھ میل فرق ہوگا، پھر ملتان کا قبلہ کوفہ بتانا کیسے صحیح ہوا،

کراچی کا قبلہ مدینہ طیبہ بتانا بھی عجیب ہے، کراچی کا عرض البلد کہ ۲۵ درجہ مدینہ منورہ کا عرض الدک ۲۴ درجہ ۲۰ دقیقہ ہے مابین العرضین ق م ۴۰ دقیقہ طول کراچی سنز ۶۷ درجہ طول مدینہ طیبہ م نہ ۴۰ درجہ ۵۵ دقیقہ فصل طول ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ ۴۰ سکنڈ فرق مسافت ۲۳۲۷ میل تو ۴۰ دقیقہ پر ۲۲ میل فرق ہوگا،

مدراس کا قبلہ عدن بھی نہیں ہو سکتا، عرض مدراس یج ب ق ۱۳ درجہ ۲ دقیقہ، عرض عدن یب مہ ۱۲ درجہ ۴۵ دقیقہ مابین العرضین یز ۱۷ دقیقہ طول مدراس ف کث ۸۰ درجہ ۲۲ دقیقہ طول عدن مہ ح ۴۵ درجہ ۳ دقیقہ مابین الطولین لہ یط ۳۵ درجہ ۱۹ دقیقہ فصل طول ۲ گھنٹہ ۲۱ منٹ ۱۶ سکنڈ فرق مسافت ۲۳۲۲ میل یعنی ان ہی کے حساب سے ۱۱ میل کا فرق ہوگا، مدراس کا قبلہ عدن بتانا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

بمبئی کا قبلہ بندرگاہ سواکن بتانا اگر مجذوب کی بڑ نہیں تو اور کیا ہے؟ عرض بمبئی یح نہ ۱۸ درجہ ۵۵ دقیقہ ہے، عرض سواکن یط ل ۱۹ درجہ ۳۰ دقیقہ مابین العرضین لہ لہ ۳۵ درجہ ۳۵ دقیقہ، فصل طول دو گھنٹہ ۲۲ منٹ ۲۰ سکنڈ فرق مسافت ۲۳۷۵ میل تو آپ ہی کے حساب سے ۲۰ میل کا فرق ہوا، ایسی صورت میں بمبئی کا قبلہ سواکن بتانا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے،

غرض جہاں جہاں کا قبلہ مشرقی صاحب نے جن جن شہروں کو بتایا ہے کل کا کل غلط ہے، نہ واقعہ کے اعتبار سے یہ شہر قبلہ ہیں اور نہ مشرقی صاحب کے قاعدہ کے مطابق، سب سے کم فرق امرتسر اور بیت المقدس کے نقطۂ مغرب میں ہے وہ بھی ۳ میل ہے، اور سب سے زیادہ ملتان اور کوفہ میں ہے، جس میں ایک سو چھیاسٹھ میل کا فرق ہے،

(باقی)

ولی کے متعلق کچھ اور

یعنی

ریاض الادب ولی ویلوری

سنہ ۱۳۵۷ھ

از

جناب غلام مصطفےٰ خانصاحب ایم اے، ایل ایل-بی (علیگ) اسسٹنٹ لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج، امراؤتی

ولی ویلوری کی پہلی مثنوی گذشتہ سال عزیزی فہیم الدین صاحب کے توسط سے ایک پرانی قلمی کتاب دیکھنے میں آئی، اس کے شروع اور آخر کے چند اوراق نہیں ہیں، بغور دیکھا تو معلوم ہوا کہ آخری تین چوتھائی حصے میں مثنوی روضۃ الشہدار ہے، جس کی مجلس دہم میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق ۲۶ شعر ہیں، پھر "پیر معمر کی حکایت" کی سرخی ہے، لیکن اس کے بعد اشعار نہیں ہیں، اس مثنوی میں دس فصلیں ہیں اور ہر فصل کا نام مجلس ہے، اور عموماً ہر مجلس کے آخر میں ولی کا تخلص موجود ہے، مثلاً:-

مجلس دوم میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کا حال ہے جس کے آخر میں ہے:-

ولی توں بول صلوٰۃ ہر دم — بیان کر نامۂ دوم کوں مختم

مجلس چہارم کے آخر میں ہے:-

ولی ہرگز نہیں اس غم کوں غایت — توں کر صلوٰۃ سوں نامہ نہایت

مجلس پنجم کے آخر میں ہے:-

ولی شاہِ ولایت سوں مدد منگ — اتا کر مجلس ششم میں آہنگ

چھٹی مجلس کی کر اب عذر لیبی — سنا طفلاں یتیماں کی غریبی

مجلس ہفتم کے آخر میں ہے:-

ولی یوں ذکر رک صلوٰۃ کوں بول — زباں اب مجلس ہشتم منی کھول

مجلس نہم کے آخر میں ہے:-

رہیا جویاں سوں باقی ذکر عاشور — دہم مجلس میں سب ہوئے گا مذکور

ولی صلوٰۃ پر رک اس بیاں کوں — دکھانی مہدیِ آخر زماں کوں

جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے ولی دکھنی (ویلوری) کے بیان میں ڈاکٹر ایتھے کے حوالے سے روضۃ الشہدار کے مضامین کی جو فہرست دی ہے اس کا مقابلہ جو اس قلمی مثنوی کے مضامین سے کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ بالکل وہی ہے، اور پھر ولی کے جو اشعار حکیم صاحب موصوف نے اردوے قدیم کے آخر میں مجلس سوم میں سے چن چن کر نقل کئے ہیں، ان کو اس قلمی مثنوی کے اشعار سے ملایا تو کامل یقین ہوا کہ واقعی یہ وہی مثنوی ہے، اور یوں بھی اس کا یہی نام مثنوی کے شروع میں لکھا ہوا ہے، یہ مثنوی غالباً بمبئی میں دو مرتبہ چھپ چکی ہے، لیکن میں نے مطبوعہ نہیں دیکھی،

روضۃ الانوار اسی قلمی نسخے کے شروع کے ایک چوتھائی حصے میں ایک دوسری مثنوی موسوم بہ روضۃ الانوار لکھی ہوئی ہے، اس کے متعلق میں نے مولانا عبدالحق صاحب اور علامہ سید سلیمان ندوی کے علاوہ اور صاحبان سے بھی معلوم کیا کہ شاید ہندوستان میں اس کا کوئی دوسرا قلمی نسخہ مل سکے لیکن معلوم ہوا کہ کہیں نہیں ہے، میرے پاس جو نسخہ ہے اس میں شروع کے چند اوراق نہیں ہیں، روضۃ الشہدار کے مقابلہ میں (جس کے اشعار تقریباً ساڑھے سات ہزار ہیں) یہ مثنوی تقریباً ایک تہائی ہے، آخر میں کل اشعار کی تعداد بھی دی گئی ہے جو ۲۲۴۰ (دو ہزار دو سو چالیس) ہے، ہر صفحے پر عموماً ۱۶ شعر ہیں، اور ہر ورق

پر سلسلہ کے ساتھ اشعار کی تعداد بھی دیدی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع کے ۲۰ شعر اس مثنوی میں نہیں ہیں، کاش یہ اشعار کہیں ہوتے تو بہت سی ضروری باتیں شاید پردۂ خفا سے باہر آجاتیں، اس مثنوی روضۃ الانوار کے آخر کے چند اشعار یہ ہیں:۔

وداع کر ایک ایک خویشاں وہاں کے
مدینہ پھر چلے مرسلِ جہاں کے

کہ جانے میں ہوا آزار آغاز
کئے کوچ آخریں کے تیں سرافراز

بیاں دو روضۃ الشہدا ہیں ارقام
ہوا یاں روضۃ الانوار اتمام

درود اں ہیں ہزاراں لک دمادم
براں سردفترِ ایجادِ عالم

ہوا تصنیف اس کا ہجر سن سوں
"بنی کے باغ دیں" میں بوجھ لے تو ۱۱۵۹ھ

ربیع الآخریں میں بیست یک کم
ہوا یو نور کا نامہ متمم

پھر لکھا ہوا ہے:۔

"چہار شنبہ۔ بتاریخ ۱۹ شہر ربیع آخر سنہ ۱۱۵۹ھ"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تصنیف کے ساتھ ہی اس کی کتابت بھی ہوئی،

مذکورۂ بالا اشعار کے پڑھنے سے چار باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

۱۔ ان میں جو تیسرا شعر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روضۃ الشہدا اور روضۃ الانوار کا مصنف ایک ہی ہے،

۲۔ اسی شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے روضۃ الشہدا لکھی جا چکی تھی، اس کے بعد روضۃ الانوار لکھی گئی، ورنہ بغیر اس کے لکھے ہوئے اس کا اشارہ یہاں کرنا ہی فضول تھا، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ روضۃ الشہدا سنہ ۱۱۵۹ھ سے بہت پہلے لکھی جا چکی تھی، جس کے متعلق ہم آگے بحث کریں گے،

۳۔ یہ مثنوی روضۃ الانوار (چہار شنبہ) ۱۹ ربیع الآخر سنہ ۱۱۵۹ھ میں لکھی گئی،

(۴) لفظ "روضۃ الانوار" اور آخر شعر کے آخر مصرعہ کے لفظ "نور کا نامہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور وغیرہ سے متعلق ہے، اسی مضمون کے اشعار اس مثنوی میں ہیں، میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اس مثنوی کے شروع کے ۲۰ شعر نہیں ہیں، تاہم اس کے بعد کے جو اشعار ملتے ہیں ان سے بھی وہی مضمون سمجھ میں آتا ہے، یہ اشعار بہت مشکل سے پڑھے گئے، بعض الفاظ بالکل نہ پڑھے جا سکے،

میرا رزاق ہور بخشندۂ جاں
توں مارنہار . . . . . .

کہ اے نور حبیبیت سوں موصوف
ہے عارف توں پرستش . . . .

نشاں عارف کا ہے عشق و محبت
محبت کی نشانی ہے عبادت

پرستش کر مری تا ہوئے بنیاد
کہ عاشق کوں اول محبوب کا یاد

ہوا مشغول دیں او نیک نامی
ہزار سترہ برس اندر قیامی

سنیا یک قبضۂ نور از نور ذاتی
ہراں انوار ذاتی وصفاتی

وہ نورِ احمدی سجدہ بجالائے
توجہ ہور نظر سوں فیضِ حق پائے

نمازِ صبح اس سجدہ بدل فرض
ہوا اس پر ہور اس امت اپر فرض

بھی اُٹھ سترہ ہزاراں برس دیگر
کھڑیا خدمت میں او نورِ مطہر

جو نورِ خاص حق سوں پا کو خلعت
کیا ہے سجدۂ ثانی تحیت

نمازِ ظہر ہو بھی فرض اس پر
ہور اُن کی امتاں او پر سراسر

کئے ہیں پنچ قیاماں او اسی دہات
سو پائے پانچ حق سوں یو عطیات

جواب معہود ہے سب پر موقت
اسی دن سوں ہے بنیادِ سعادت

پچاسی الف برساں جب ہوئے پور
حکم آیا دوگانہ کا آں نور

بہی تکبیر تحریمہ الف سال ۔۔۔ اسی دھاتوں ہر یک ارکان کا حال

رکوع وسجدہ قعدہ باقیا ماں ۔۔۔ کہ قومہ ہور جلسہ باسلاماں

یہ سولہ شعر پہلے صفحے کے ہیں، ان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلہ کے جو ۶، شعر پہلے تھے وہ بھی نور نبویؐ کی پیدائش وغیرہ کے متعلق رہے ہوں گے، ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ کلیات ولی اورنگ آبادی (مرتبہ استاذی حضرت احسن صاحب مارہروی دامت برکاتہ) میں جو پہلی مثنوی مناجات کے متعلق ہے اس کے اکتیس (۳۱) شعر اور دوسری مثنوی (در تعریف شہر سورت) کے کم از کم آخری تین شعر اس مثنوی روضۃ الانوار کے شروع میں رہے ہوں گے، جو زمانہ کی دست برد سے ایک لڑی سے بکھر گئے، کیونکہ بحر بالکل وہی ہے یعنی ہزج، مسدس، محذوف اور یہ متفرق اشعار بتلا بھی رہے ہیں کہ ان میں عشق حقیقی کی طرف میلان ہے، جوش ہے، ولولہ ہے، گویا آنے والے نفس مضمون سے یہ اشعار متاثر ہیں، یا یوں کہہ لیجئے کہ یہ اشعار براعۃ الاستہلال ہیں اور بے شک نور محمدی کی پیدائش، نمو اور جہاں افروزی سے متعلق ہیں،

استاذی موصوف کا یہ خیال کہ مثنویات کے یہ ۸، شعر شاید مثنوی روضۃ الشہداء کی تمہید میں ہوں (مقدمہ صفحہ ۹) صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ روضۃ الشہداء ہمارے پیش نظر ہے اور اس کے شروع میں یہ شعر نہیں ہیں اور ہونا بھی نہیں چاہئے کیونکہ مثنوی روضۃ الشہداء کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے حال سے ہے، جس کی تمہید میں شاعر کا لہجہ پُرالم ہونا چاہئے اور مذکورہ ۸، شعروں میں یہ بات نہیں ہے،

بہرحال اب بھی ہم ان اشعار کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے، بہت ممکن ہے (جیسا کہ نصیر الدین صاحب ہاشمی کا خیال ہے) کہ ولی اورنگ آبادی نے کسی مثنوی کو لکھنا شروع کیا ہو لیکن پھر مکمل نہ کر سکے ہوں،

اب میں مثنوی روضۃ الانوار کے مضامین کی فہرست ذیل میں پیش کرتا ہوں:۔

ذکر نور نبویؐ (یہ سرخی اس مخطوطہ میں نہیں ہے، مضمون کے اعتبار سے میں نے خود بنالی ہے) ذکر عبد اللہ ۔ ذکر حمل ماندن آمنہ (اس نسخہ میں یہی لفظ ہے) ذکر واقعات در مدت حمل بر آمنہ ۔ ذکر ولادت حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ۔ باب در بیان شیر خوردن آں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ۔ در بیان سفر شام بار دوم بوکالت خدیجہ رضی اللہ عنہا (یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ سفر شام بار اول کا ذکر کیوں نہیں کیا، کہ ولی ایک ہی سرخی میں کئی اور باتیں بھی بیان کر گئے ہیں، اسی طرح پہلے سفر کے متعلق اس سے پہلے کے بیان میں لکھ گئے ہیں) تقریب خواستگاری خدیجہ و ذکر تعداد اولاد النبی صلعم، تعداد فرزندان و امہات المومنین رضی اللہ عنہم اجمعین، ذکر ابتداء وحی پیغمبر اسلام امیر حمزہؓ ۔ اسلام آوردن عمر خطابؓ ۔ ذکر دعوت اقربا ۔ ہجرت کردن اصحاب رسول اللہ بار دوم جانب شام ۔ ذکر شمائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۔ وفات حضرت بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا ۔ وفات ابو طالب ۔ (سال دوازدہم از نبوت) در ذکر معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم تقریب مضمون رازہائے پنہانی ۔ بیان فرمودن ذکر معراج و تصدیق دوستان و تکذیب نمودن و ابائے جفائے دشمناں ۔ ذکر ہجرت نمودن از مکہ بہ مدینہ منورہ ۔ ذکر نکاح ام حبیبہ بنت سفیان و آمدن ماریہ و فوت نجاشی ۔ ذکر معجزات (چالیس معجزوں کا بیان ہے) ذکر کشتی کردن با ابو جہل ۔ ذکر جنگ بدر، ذکر جنگ احد ۔ جنگ سیوم احزاب ۔ جنگ چہارم بنی قریظہ ۔ جنگ پنجم تبوک ۔ ذکر افک عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ۔ جنگ ششم فتح خیبر ۔ جنگ ہفتم فتح مکہ معظمہ ۔ جنگ ہشتم فتح حنین ۔ جنگ نہم فتح طائف ۔ ذکر حج الوداع،

اس مثنوی کے شروع کے اشعار سے ولی کی زبان کی جھلک تو معلوم ہو چکی ہو گی، لیکن کچھ اور اشعار ملاحظہ فرمالیجئے،

(تقریب مضمون رازہائے پنہانی)

کیے یو نقل حضرت عمرؓ خطاب ۔ ہوا معراج کا جس دن خوشی باب

کیا حضرت رسول اللہ سوں میں سوال ۔ نہانی راز ہا کا کچھ کرو قال

سو فرمائے کہ امت کا شکایت ۔ کیا منجات یوں وورب عزت

کہ عصیاں ورز ہیں سب مل بخلوت ۔ کریں وو انجمن میانی اطاعت

ولے میں پردہ پوشی میں ہوں ستار ۔ ہوں دائم بخشش رحمت سوں غفار

علی مرتضیٰؓ سوں ہے یو منقول ۔ سخن رازِ نہانی کا یو مدلول

گنہ کرتے تھے امتاں پیشیں ۔ عذاباں ترت ان پر تھے سو تعیین

کہ بعضے غرق ہو در آب طوفاں ۔ ہو گیتے آب رودِ نیل غرقاں

کیتاں کوں صیحۂ جبریل سوں مار ۔ ہوا بعضیاں اُپر بارانِ سنگسار

کیتے غرقِ زمیں میں مثلِ قاروں ۔ چلے جاتے اچھوں تحت الثریٰ کوں

کیتاں کے تیں سو مسخ صورتاں کر ۔ ہوے تلپٹ کتے از بادِ صرصر

کیتاں کوں بھیں سمیت اُٹھا کو مارے ۔ جہنم کے لئے وو باٹ سارے

ولیکن تجھ امت کوں یا محمدؐ ۔ بدی ان کی کوں کر نیکی ستی رد

تری امت ہیں منجھ کوں بہوت پیاری ۔ غضب ہور قہر سوں یو ہیں کناری

روایت یوں ہے از خاتونِ جنت ۔ کہ یو تھے راز ہار باعطیت

کہ میں ہوں ضامنِ رزقِ مقرر ۔ ولے نیں اعتبار ان کا میرے پر

سدا ہیں رزق کے یو تنگ دوسی میں ۔ فکر سوں منتظر اس سگ ردی میں

بہشت ان کے رہیں کوں میں نبایا ۔ سو یو شقے ہیں یاں دوزخ کا پایا

نڈر کہ منجھ سوں لوکاں نوں ڈریں یو ۔ جو خلوت میں گناہاں نت کریں یو

نہ مانگوں میں صبا کا آج اعمال ۔ یو مانگیں رزقِ ہفتہ ماہ ہور سال

میں ان کا رزق ان کوں دیتا ہوں ۔ یو میری بندگی دیویں دوجی کوں

کہ یعنی ہے ریا سوں اس سوں نیکی ۔ سو بے شک غیر کی ہے دو شریکی

ملائک ان کے بد اعمال ہر دم ۔ کریں آ عرض منجھ سوں بیش ہور کم

کدھیں میں نیں کیا ان کی شکایت ۔ فرشتیاں کے ان کے ان کی مذمت

پڑے ان پر مصیبت گر ذرا بی ۔ ہوویں شکوہ منی کر اضطرابی

کریں سب خلق کوں احوال ظاہر ۔ اپس کی قسمت اوپر نا ہو شاکر

تری امت کے کردارِ شر ہیں ۔ نہ دیکھیا غیر عفو و درگذر میں

منجے لایا ہے کیا ہدیہ دنیا سوں ۔ کہے لایا ہوں دو چیزاں نبٹ دوں

یکے تقصیر امرِ بندگی ہے ۔ دوجی عصیان کی شرمندگی ہے

کیا تقصیر میں، رحمت ہے بھرپور ۔ شفاعت سوں تری عصیاں گیا دور

کیے حضرت نبیؐ پھر عرض یوں واں ۔ کہ سب امت کو بخش اے پاک سبحاں

کہیا بخشیا یک حصہ آج کی رات ۔ قیامت کوں دو حصہ از شفاعات

ہوا یاں مختصر معراج نامہ ۔ مطول سوں تھکیا تحریر خامہ

اب زبان کا پورا اندازہ ہو گیا ہو گا، لیکن چونکہ یہ مثنوی نایاب ہے اسکے چند شعر اور سن لیجئے،

(معجزہ سی و ششم)

نبیؐ کے پاس آئے کافراں مل ۔ طلب دھر معجزہ کا ہو کو یک دل

ہوائے آستیں میں کھوڑ بھوڑ ایک ۔ سو ہو کر متفق دل یک سوں جوڑا یک

کیے گر شاہدی ہم اس سو پاویں
نبوت پر یقین تب لے کو آویں

دیے آتیں سوں مجلس منی ڈال
کیے دیو معجزہ اس سونچہ فی الحال

نبیؐ فرمائے اس کوں اے جانور
توں اٹھ کر دے گواہی اس مکان پر

خدا کے حکم سوں وو اٹھ کو دیں تد
کہیا سانچا رسول اللہ محمدؐ

پیمبر اس امت کا ہے یو بے شک
قبولو دین اس کا سب یقین رک

دیا حیوانِ مردہ جب گواہی
ہوے سب فیض مند ایماں پناہی

مثنوی روضۃ العقبیٰ | اب ولی کی تیسری مثنوی بھی معلوم کر لیجئے، جن اوراق میں مثنوی روضۃ الانوار لکھی ہوئی ہے ان کے حاشیوں پر ایک اور مثنوی ہے جس کا نام روضۃ العقبیٰ ہے، اور یہ مثنوی بھی ولی کی ہے، جیسا کہ آگے بتایا جائے گا، افسوس کہ حاشیہ اتنا زیادہ کٹا ہوا ہے کہ آدھے آدھے مصرع نہیں ہیں، تاہم شروع اور آخر کے کچھ شعر جو پڑھے جا سکے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں،

اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے،

ہو اللہ السمیع الحی و قادر
ہو الرب البصیر البطن و ظاہر

ہو الجبار و قہار و معدل
ہو الستار و غفار و مفضل

.... بخشندہ سزا کا مغفرت سوں
..... جزا کا آخرت کوں

.... وے اذنِ شفاعت
..... عاصیاں کے تیں امید جنت

آخر کے اشعار صاف اور پورے پورے ہیں،

الٰہی توں اہے بینا و دانا
یو میری ضعفِ نیت پر توانا

کیا تالیف یو میں مختصر قال
ترے محبوب پیغمبرؐ کا احوال

سو حالِ آخرت سب اس میں لایا
سکل خوف و رجایاں کوں سنایا

وعید و وعدہ لایا ہوں جمع کر
وعیداں سوں ڈریں وعدہ پو دل دھر

کیا میں فارسی، دکھنی میں منظوم
کہ تا ہووے ہریک کوں ترت معلوم

الٰہی توں ہے غفار و عطا کوش
ضعیفاں کا غلط، سہو و خطا پوش

کتاب مطلع الانوار سوں دیک
کیا ہوں دو کتاباں نسخۂ نیک

کہ یک ہے روضۃ الانوار اول
دویم یو روضۃ العقبیٰ .....

الٰہی دے لکھنہارے کے تیں ذوق
پڑھنہار و سننہارے کوں اَت شوق

لکھے اس کوں، پڑھے، سنکر سناوے
کہ اس نسخہ کے تیں شہرت میں لاوے

سُنے پر دل ہووے ہر ایک کا شاد
مصنف کوں کرے قل فاتحہ یاد

لکھیا کاغذ پو رہے یو تا قیامت
مصنف کا قل و الحمد اجرت

... گیارہ سو پو باسٹ ہجرتی سال
سنہ کم اس میں سوں فصلی کا اتھا چال

ہزار او پر سہ صد پنجاہ ابیات
دویم تاریخ ذی الحجہ کی جمعرات

ہوایاں روضۃ العقبیٰ تماماں
رسولؐ اللہ پر صلوٰۃ و سلاماں

تمت تمام شد۔
کارِ من نظام شد

"للہ" دویم ذی الحجہ سنہ ۱۱۶۲ھ روز پنجشنبہ مطابق سنہ ۱۱۵۹ فصلی، چہارم ماہ آسوج کہ در ہند کوار گویند"

اس آخری عبارت سے بھی خیال ہوتا ہے کہ تصنیف کے ساتھ ہی کتابت ہوئی،

ان آخری اشعار کے دیکھنے سے پانچ باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

(۱) جس طرح روضۃ الشہداء اور روضۃ الانوار کا مصنف ایک ہی ہے، اسی طرح روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ کا مصنف بھی ایک ہی ہے، یعنی ولی ہی نے یہ تینوں مثنویاں لکھی ہیں،

(۲) روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ کا ماخذ فارسی کتاب مطلع الانوار ہے جو شاید عرفی کی تصنیف ہے، خواجو کرمانی نے بھی ایک مثنوی روضۃ الانوار فارسی میں لکھی تھی، جو رام پور میں ہے، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ عرفی اور خواجو کرمانی کی تصنیفوں سے ہماری ان مثنویوں کو کوئی تعلق ہے یا نہیں

(۳) ہم دیکھ چکے ہیں کہ روضۃ الانوار ۱۱۵۹ھ میں لکھی گئی تھی، اس کے تین سال بعد روضۃ العقبیٰ (۱۱۶۲ھ مطابق ۱۱۵۹ فصلی) لکھی گئی، جس میں ایک ہزار تین سو پچاس اشعار ہیں،

(۴) ان تین مثنویوں کے سلسلہ وار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ خالص مذہبی مذاق میں بسر کیا اور اپنی شاعری سے دینی اور دنیوی دونوں فائدے حاصل کرنے کی کوشش کی،

(۵) بہت ممکن ہے کہ یہ مثنویاں ولی ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہوں جو مشہور نہ ہو سکیں کیونکہ ان کی اور نقلیں کسی دوسری جگہ نہیں پائی جاتیں، اس نسخے میں کئی مقامات پر "لیلے" (اس طرح کے) دستخط موجود ہیں، بہت ممکن ہے کہ یہ دستخط ولی ہی کے ہوں، اس کا کاغذ بھی بہت پرانا معلوم ہوتا ہے جو یقینی دو سو سال کا ہوگا، مثنوی روضۃ الانوار کے آخری الفاظ "چہار شنبہ بتاریخ ۱۹ ار شہر ربیع آخر ۱۱۵۹ھ" اور مثنوی روضۃ العقبیٰ کے آخری الفاظ "تمت تمام شد کارِ من نظام شد، لیلے دوئیم ذی الحجہ ۱۱۶۲ھ روز پنج شنبہ، ۱۱۵۹ فصلی۔ چہارم ماہ آسوج کہ در ہند کوار گویند" کی تفصیل سے بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، خیر اس سے ہم کو بحث نہیں، اب ہم مثنوی روضۃ العقبیٰ کے مضامین کی فہرست ذیل میں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ یہ مثنوی بھی خالص مذہبی رنگ میں ہے:-

حمد خدا، نعت نبی، مناقب خلفاے راشدینؓ، بیان سکرات موت، بیان قبر، حکایت بخیل، ذکر قیامت، ذکر امام مہدی علیہ السلام، ذکر دجال، ذکر حضرت عیسیٰ صلوٰۃ اللہ علیہ و

علی نبینا والسلام، ذکر خروج یاجوج و ماجوج، ذکر فوت عیسیٰ صلوٰۃ اللہ علی نبینا و علیہ، ذکر قیامت و نفخ صور و احیاء اموات و حشر قیام، ذکر خروج دابۃ الارض، ذکر طلوع شمس از مغرب، ذکر معاتبہ و محاسبہ و امتیاز مومناں از کافراں، ذکر منافقان و کافراں، احضار عیسیٰ بن مریم و یہود و نصاریٰ، ذکر دیگر، ذکر دوزخ و پل صراط و گذشتن مومناں و افتادن کافراں و احوال .... ذکر تعذیب عصاۃ مومناں و شفاعت انبیا و رسل و ملئکہ، ذکر دخول جنت و درجات مومناں

چونکہ یہ مثنوی (روضۃ العقبیٰ) حاشیہ پر ہے اور حاشیہ بہت زیادہ شکستہ اور کٹا ہوا ہے اس لئے فی الحال ہم صرف کچھ اور اشعار لکھ کر ختم کرتے ہیں، اگر ہو سکا تو پھر کبھی اس پر غور کیا جائیگا شفاعت کے بیان کے کچھ اشعار صاف پڑھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں،

سو سب مل آئیں نزد حضرت آدمؑ — کہیں اے جدّ بہتر ہور کرم

.... قدرت سوں تم ہیں آفریدہ — کہ مسجود ملک، جنت رسیدہ

.... سوں ہیں سب امید داری — شفاعت آج تم کرنا ہماری

کہیں۔ میں ہوں گنہ گار ہر عمل — گنہ کا مینچ ڈالیا پایہ اوّل

سما منجہ کوں منع جا نا جھاڑ کے پاس — سوکھا یا توڑ دیک میٹھا و خوش باس

نہ جرأت ہی کروں ہیں عرض حق سوں — اسی شرمندگی سوں سرنگوں ہوں

سو جا کر نوحؑ سوں یو بات بولو — ضروری ہے غرض اس سات بولو

کہیں تب نوحؑ سوں اے جدّ ثانی — اب طول العمر اے کشتی رانی

بہوت لاچار ہیں ہم بے وسیلہ — کرو تم کچھ شفاعت کا سو حیلہ

کہیں نوحؑ نبی اسے دیندار اں — تمن سوں میں ادک ہوں ننگار اں

دعاے بد کیا ہیں آدمیاں کوں — کیا طوفاں تلف سارے جہاں کوں

کہ تھے اُن میں خلائق جیو جنتر دواب و وحشی طیراں جناور

رہیا نیں نیک و بد کا کچھ وہاں فرق کہ ایکیچہ بار سب مل ہو گئے غرق

جیوں آتے سات گھن پیسے گئے سب پشیمانی سوں شرمندہ ہوں میں اب

سو منجہ خجلت زدہ سوں نا رکھو آس تمیں جاؤ خلیل اللہ کے پاس

کہیں جا حضرت ابراہیمؑ کے کن کہ اے سردار ملتؑ دین روشن

کہ خلعت سوں ہے تمنا سرفرازی شفاعت کی کرو کچھ کارسازی

کہیں۔ ہوں حق تعالیٰ سوں شرم (گیں) کہ بولیا جھوٹ دنیا میانی (رہوں) تین

اوّل ہوں میں کہیا بیمار سُستی نہ تھا بیمار، تھا میں تندرستی

دوجا۔ سارہ کوں بولیا بھاں ہے گھر کہ تھی عورت وو میری سچہ مقرر

تجا۔ سارے بتاں کو مینچہ توڑا بڑے بت پر جھوٹا بہتان جوڑا

یو تینو میں گناہاں سوں ہوں حیراں شفاعت دوسریاں کی میں کروں کاں

مگر موسیٰ کلیم اللہ ہے ایک بہت گستاخ حق سوں 'لاڑلا' نیک

سو جا موسیٰ سوں لاویں التجاواں کہے۔ میں خونِ قبطی سوں پشیماں

تمیں عیسیٰ کنے یو عرض لے جاؤ کہ روح اللہ سوں یو آرزو پاؤ

کہ اے زندہ کن مردہ سہ صد سال شفاعت کر یو وقتِ مشکلِ حال

کہے عیسیٰ کہ میری قوم بد تر کہے فرزند خدا کا منجہ مقرر

خدا ہور میری ماں ہور تیسرا میں کہے تینو خدایاں یو جدا نیں

پڑیا ہے اس خجالت میں میرا من ۔۔۔ مل جائیں سب ختم النبیؐ کن

۔۔۔ ہور جملہ انبیا سب ۔۔۔ مصطفیٰؐ کن آئیں گے تب

۔۔۔۔ آخر اسی جھنڈے تلے کام شفیع محشر امت خاص ہور عام

یو سب مل کر کہیں گے یا محمدؐ کہ کرتا نیں خدا تیرا سخن رد

کرم جو کچھ خدا کا ہے تیرے پر ۔۔۔ وو نیں مرحمت بر غیر دیگر

ہماری امتاں کی کر شفاعت محمدؐ تب منگیں حق سوں اجازت

کہیں گے یا الٰہِ ربِّ عزّت منگوں گستاخ ہو میں تیری خدمت

کہ عرض حال سب درماندگاں کا کروں تشفیع امت راندگاں کا

سو آوے حکم سید مرسلیں کوں تیرے بدلے کیا میں سب جہاں کوں

تیرے سوں ہوئی خدائی آشکارا زمین و آسماں نقش و نگارا

نہ ہوتا توں تو کچھ درکار نیں تھا نہ ہوتا توں تو کچھ سنسار نیں تھا

یو شور و غلغلہ غوغائے محشر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تُہیں ہے سب کا سردار آج کے دن ترا ہے گرم بازار آج کے دن

تیری حاصل مراداں آج کے دن تُہیں ہے فرح و شاداں آج کے دن

جو کچھ منگتا ہے منگ اے دوست میرے کہ میں ہوں سب رضامندی میں تیرے

نبیؐ کوں جب ہووے اذنِ شفاعت سو زیرِ عرش کر سجدہ بخدمت

جو سجدہ سوں اٹھا سر وو مکرم کرے حمد و ثنا رب عالم

خداوندا یو ہیں مشت گنہگار پشیماں اپنی گفتار و کردار

اگر بخشے گا تو تو ہے سزاوار جو رانے گا تو وو بندہ گنہگار

جو دوزخ میں ہیں عاصی ہور پل پر پڑے گی یک لکیر حد سراسر

شفاعت سوں تیری اتنی ۔۔۔ سو پھر سجدہ کریں وو شاہ جگ ۔۔۔

سو ہوئے حکم۔ سجدہ سوں اٹھا سر کیا میں مغفرت بھی اتنی ۔ ۔ ۔

تجے سجدہ میں سب امت کوں بخشائیں شفیع المذنبیں آرام تب پائیں

جب یہ معلوم ہو چکا کہ یہ تینوں مثنویاں ایک ہی شخص (ولی) کی لکھی ہوئی ہیں، تو اب دیکھنا یہ ہے کہ کس ولی کو ان کے لکھنے کا فخر حاصل ہے، سب سے پہلے روضۃ الشہدار کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔

کلیات ولی (مرتبہ استاذی حضرت احسن مارہروی) کے طبع ہو جانے پر ایک مشہور محقق کو یہ خیال گذرا کہ مثنوی "دہ مجلس" ولی اورنگ آبادی کی تصنیف ہے اور روضۃ الشہدار ولی دکھنی (دیلوری) کی ہے، جو صحیح نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مجمع النوادر کا نام چار مقالوں کی وجہ سے چہار مقالہ پڑ گیا، اسی طرح مثنوی روضۃ الشہدار کا نام دس مجلسوں (فصلوں) کی وجہ سے "دہ مجلس" بھی ہے، کیونکہ اس نام کی کوئی مثنوی (روضۃ الشہدا، سے مختلف اور اس کے علاوہ) کہیں موجود نہیں ہے،

"اردوے قدیم" میں غالباً ڈاکٹر ایتھے کے حوالہ سے یہ بتایا گیا ہے کہ روضۃ الشہدار کا سنہ تصنیف ۱۱۱۹ھ ہے، جو اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے،

گیا ہوں جب ختم یو درد کا حال اگیارہ سو پو تھا انیسواں سال

میرے خیال میں یہ سنہ صحیح نہیں ہے، افسوس ہے کہ جو مخطوطہ میرے پیش نظر ہے اسکے آخر کے چند اوراق نہیں ہیں، ورنہ سنہ ضرور معلوم ہو سکتا، جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے رسالہ اردو (مورخہ اکتوبر ۱۹۲۶ء) میں کتب خانہ انڈیا آفس کے اردو مخطوطات کے متعلق پروفیسر بلوم ہارٹ کی فہرست کا جو اقتباس دیا ہے اس میں ولی کی روضۃ الشہدار کی تاریخ تصنیف ۱۱۳۰ھ ہے (مکتوبہ پال گھاٹ ۱۲۱۶ھ - ۱۰۶ ورق) یعنی مذکورۂ بالا تاریخ سے یہ تاریخ مختلف ہے، میرا خیال ہے کہ زیادہ معتبر تاریخ وہ ہے جو استاذی حضرت احسن مارہروی نے کلیات

ولی صفحہ ۳۸۶ میں لکھی ہے اور وہ یہ ہے :-

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال گیا را سو پو تھا اکتالیسواں سال

کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول "ولی کا ہے سخن حق پاس مقبول" ۱۱۴۱ھ

مولانا عبد الجبار خاں صاحب ملکاپوری نے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ یوں لکھا ہے:ع

تھا گیا را سو پو اکتالیسواں سال

بہرحال یہ مصرعہ صحیح ہو یا غلط، لیکن کم از کم دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ ہرگز غلط نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تاریخی مصرعہ ہے جس سے ۱۱۴۱ھ نکلتا ہے، کلیاتِ ولی (مطبوعۂ مذکورہ) کے آخر میں مولانا عبد الحق صاحب نے دو ضمیمے بھی لگائے ہیں، دوسرا ضمیمہ اختلافِ نسخ کا ہے لیکن اس میں مذکورہ قطعۂ تاریخ کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا گیا، جس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ حضرت احسن کے نسخوں کے علاوہ اور جتنے نسخے مولانائے موصوف کی نظر سے گذرے، ان سب میں یہی قطعۂ تاریخ تھا جسے شاید غلطی سے کسی کاتب نے اپنے نسخے میں ولی اورنگ آبادی کا سمجھ کر نقل کر لیا ہو، اور پھر دوسرے کاتبوں نے اس کی تقلید کی ہو، یا یہ کہ دو ولیوں کے ہم عصر ہونے کی وجہ سے اسی زمانہ میں کلام میں غلط ملط ہو گیا ہو، بہرحال مثنوی روضۃ الشہدار کی تاریخ ۱۱۱۹ھ یوں بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ۱۱۵۹ھ میں ولی نے روضۃ الانوار لکھی اور اس کے تین سال کے بعد ۱۱۶۲ھ میں تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار کی تیسری مثنوی روضۃ العقبیٰ لکھی، اس لئے ایسے پرگو اور زود گو شاعر کے متعلق یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ۱۱۱۹ھ میں روضۃ الشہدار لکھ کر ۴۰ سال خاموش بیٹھا رہے اور پھر ۱۱۵۹ھ میں دوسری مثنوی لکھے، اور باوجود اس اتحاد زمانہ کے زبان میں کوئی فرق نہ ہو، اس لئے میرا خیال ہے کہ روضۃ الشہدار کی تاریخ ۱۱۴۱ھ ہی صحیح ہے، ہاں ایک بات ۱۱۱۹ھ کی موافقت میں یہ کہی جاسکتی ہے کہ شاید ولی نے اس سنہ میں

روضۃ الشہدا لکھ کر پھر ۱۱۴۱ھ میں اس کی دوبارہ تصحیح و نظرثانی کی ہو، اور اس وقت یہ قطعہ لکھکر شامل کر دیا ہو، جو صورت بھی ہو اتنا ضرور ثابت ہے کہ روضۃ الشہدا ۱۱۴۱ھ میں اگر پہلی بار نہیں تو دوسری بار ضرور لکھی گئی، اس کے بعد ۱۱۵۹ھ میں روضۃ الانوار اور ۱۱۶۲ھ میں روضۃ العقبیٰ لکھی گئیں، میرا خیال ہے کہ یہ تینوں مثنویاں ولی ویلوری کی ہیں اور اس کے لئے یہ حسب ذیل ثبوت ہیں:۔

(۱) جناب حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے "اردوے قدیم" میں ولی اورنگ آبادی کے حال میں لکھا ہے کہ "ہم نے دیوان ولی کا ایک قلمی نسخہ دیکھا ہے، جو ۵ رجادی الاول ۱۱۴۳ھ میں بمقام احمد آباد مکتوب ہوا ہے اور اس کے خاتمہ پر تحریر ہے:۔

تمام شد دیوان ولی رحمۃ اللہ علیہ"

اس جملہ سے ثابت ہے کہ ولی (اورنگ آبادی) نے ۱۱۴۳ھ سے پہلے وفات پائی"، مذکورہ مثنویوں خصوصاً روضۃ العقبیٰ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کم از کم ۱۱۶۲ھ تک ضرور زندہ تھے، اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ ولی جو ۱۱۴۳ھ سے پہلے قضا کر چکے تھے، ان تینوں مثنویوں کے مصنف نہیں ہو سکتے بلکہ ان کے مصنف ولی ویلوری ہیں،

(۲) حکیم صاحب موصوف نے رسالہ اردو (مورخہ اکتوبر ۱۹۲۸ء) میں بلوم ہارٹ کی فہرست کا جو اقتباس دیا ہے اس میں دیوان ولی کے ایک نسخہ کے کاتب کا نام سید محمد تقی ولد سید ابوالمعالی ہے، (مکتوبہ ۲ ذی قعدہ ۱۱۵۶ھ) اور یہ بھی لکھا ہے کہ سید محمد تقی کے والد وہی ابوالمعالی ہیں جنکے ساتھ ولی (اورنگ آبادی) نے دہلی کی سیاحت کی تھی، اسی قلمی نسخے کے آخر میں یہ عبارت ہے،

"تمت تمام شد۔ دیوان مغفرت نشان ولی محمد مرحوم، متوطن دکن، بتاریخ دویم شہر ذیقعدہ ۱۱۵۶ھ۔ روز پنجشنبہ بوقت صبح تحریر یافت، مالک و کاتب این دیوان عاجز المذنب

محمد تقی ولد سید ابوالمعالی ست، کسے کہ دعویٰ کند باطل است"۔

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہو کہ (۱) ولی اورنگ آبادی کا صحیح نام ولی محمد تھا، (۲) وہ دکن کے باشندے تھے اور (۳) ۱۱۵۶ھ سے پہلے وہ انتقال کر چکے تھے حقیقت یہ ہے کہ سید محمد تقی کے اس قول سے زیادہ معتبر اور کوئی قول نہیں ہو سکتا، کیونکہ ان کے والد سید ابوالمعالی سے ولی اورنگ آبادی کی دوستی تھی، اس تعلق کی وجہ سے ولی اورنگ آبادی کے متعلق جتنے معلومات سید محمد تقی کو ہو سکتے تھے اور کسی دوسرے کو نہیں ہو سکتے تھے، بہر حال اتنا یقینی ثابت ہے کہ اگر ۱۱۴۳ھ سے قبل نہیں تو کم از کم ۱۱۵۶ھ سے پہلے ولی اورنگ آبادی ضرور انتقال کر چکے تھے، خواہ مولانا عبد الجبار صاحب ملکاپوری یا استاذی حضرت احسن صاحب مارہروی کے قول کے مطابق ۱۱۵۵ھ تک زندہ رہے ہوں، لیکن ہماری تین مذکورہ مثنویوں کی تاریخ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم ۱۱۶۲ھ تک جو ولی زندہ تھے وہ ولی ویلوری ہی ہو سکتے ہیں،

ان دونوں ولیوں کے علاوہ ایک تیسرے ولی بھی "اردوے قدیم" میں موجود ہیں جنکا وطن بیجاپور بتایا گیا ہے، میرے پاس یہ کتاب مطبوعہ نولکشور ہے اور شاید دوسرا ایڈیشن ہے، اس میں ولی بیجاپوری کے متعلق کوئی سند نہیں دیگئی، اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید مغربی مستشرقین کے قول پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہو، جن کی رائے اکثر ایسے مواقع پر معتبر نہیں ہوتی، کیونکہ وہ لوگ بے سمجھے بوجھے بھی لکھ مارتے ہیں، وہ اگر ولی اورنگ آبادی کے اس شعر

کروں یوں سنگدل کے دل کوں تسخیر زبردستی میں بیجاپور کا گڑھ ہے

کو دیکھ پاتے تو دعویٰ کر بیٹھتے کہ کلیات ولی (مرتبہ استاذی موصوف) دراصل کلیات ولی بیجاپوری ہے، بہر حال ولی بیجاپوری کا حال ابھی تحقیق طلب ہے، ان کے متعلق فی الحال استاذی حضرت احسن مارہروی کے خیالات (مقدمہ کلیات ولی ص ۵۹) کو میں زیادہ صحیح سمجھتا ہوں، اگر ولی بیجاپوری

کوئی ہوں بھی تو ہم کو اس مضمون میں ان سے کوئی غرض نہیں ہے کیونکہ کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا، کہ مثنوی روضۃ الشہدا ان کی بھی ہوسکتی ہے،

ولی ویلوری کا مذہب آخر میں چند باتیں اور عرض کرنی ہیں، کتاب یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۲۸۴ میں ولی ویلوری کے متعلق ایک جگہ بتایا گیا ہے کہ وہ شیعہ مذہب تھے، دراصل مجھے کسی کے سنی یا شیعہ ہونے سے کوئی غرض نہیں، لیکن چونکہ یہ چیز اب تاریخی حیثیت رکھتی ہے اس لئے عرض کرنا پڑتا ہے کہ ولی ویلوری سنی ہی تھے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسی کتاب یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ ۳۶۴ میں ایک دوسری جگہ ولی ویلوری کا تعلق تصوف سے بتایا گیا ہے، اگر شیعہ کا صوفی ہونا ممکن ہے تو دوسرا ثبوت یہ ہے کہ روضۃ الشہدا کی مجلس چہارم کے آخری حصے میں اکیس شعر ہیں جن کی سرخی یہ ہے :- "غم کردنِ معاویہ بر فوتِ امام حسن رضی اللہ عنہ"۔ ان میں کے چند اشعار ذیل میں لکھے جاتے ہیں، جنھیں ہر شخص سمجھ سکتا ہے :-

کہیں بعضے یو فن چھند بند دستا   یو ظاہر با ادب ہیں دست بستہ
اُنن کے باپ کوں دی محنتِ سخت   لیا ہے ملک ان کا، تاج ہور تخت
بھی کرتے ہیں یو ظاہر کی خوشامد   کہ اس مکر و فریب و فن کوں نیں حد
عقیدہ یو کرے سو ہے روافض   گمانِ بد، صحابی پر نجائز
وہی ہے مالک دل، عالم الغیب   ہمیں بدظن ہونا کرنا کیسے عیب

ان میں چوتھا شعر قابلِ غور ہے، تنہا یہ شعر ولی ویلوری کے مذہب کے فیصلہ کے متعلق کافی ہے، ان کے علاوہ اور بہت سے ایسے اشعار ہیں جن میں حضرت ابوبکر عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی منقبت پائی جاتی ہے، دوسری دونوں مثنویوں سے اس کی ایک ایک مثال پیش کی جاتی ہے، مثنوی روضۃ الانوار میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے واقعہ میں پوری ایک فصل ہے جس میں پچاس سے زائد اشعار

ہیں، ان کے اسلام قبول کرنے پر بہت خوشی کا اظہار کیا گیا ہے، اور پھر یہ شعر ہیں،

نکل آبہار ویں حضرت عمرؓ تب   کہے اہلِ قریش و شہر میں سب
نبیؐ کی میں غلامی میں ہوا اب   اگر دیکھے گا کوئی آنک اُچا اب
نکال آنک اس کی ویں اس ٹھار ماروں   قدم پر مصطفےٰؐ کی جیو کوں واروں
لگے کرنے نمازاں آشکارا   جماعت ہور اذاں کا ہو پکارا
نبوت سوں سنہ تھا یا چاروان سال   ہوے حضرت عمرؓ یو دولت اقبال

مثنوی روضۃ العقبیٰ میں خلفاے راشدینؓ کی مختصر منقبت ہے، چنانچہ نعت کے بعد کے یہ اشعار ہیں:

درود اں اس پو ہر دم ہیں ہزاراں   . . . . . اصحاب کامل چار یاراں
اول افضل ہیں بو بکر صدیقؓ   دوجی، عادل عمرؓ فاروق تحقیق
تجی، عثمان حیا ہور حلم کی کھان   ہیں چوتھے شیر یزدان شاہ مرداں

ان مثالوں کے بعد ولی کے مذہب کے متعلق کسی گفتگو کی گنجائش باقی نہیں رہجاتی،

بعض شکوک ولی ویلوری کے متعلق مجھے ایک چیز ضرور کھٹکتی ہے، وہ یہ کہ ان کی ایک اور تصنیف رتن و پدم کا ذکر "اردوے قدیم" میں ہے، اس کے دس شعر بھی نمونۃً دیئے گئے ہیں جن میں سے نو شعر بحر ہزج، مسدس، محذوف میں ہیں، لیکن ابتدا کا ایک شعر بحر متقارب، مثمن، مقصور میں معلوم ہوتا ہے،

خدایا تو ہے پاک پروردگار   زنگار و آتار و آبجھی اتار

ولی کے یہاں اگر ترتیب میں چستی نہ ہو، مصرعوں میں سکتے ہوں اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہوں تو وہ سب قابلِ قبول ہیں، لیکن بالکل بحر ہی بدل جائے، یہ میرے ناقص خیال میں نہیں آتا، جو اشعار نقل کئے گئے ہیں ان میں دو شعر ایسے ہیں جن کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان میں ولی تخلص موجود ہے،

وؔلی تیرے کرم کی ہے مجھے آس　　نہ کر اس آس سوں ہرگز تو نیراس
وؔلی ہے یو سبب خالی بہانا　　اسی کا کام ہے دینا دلانا

میرے خیالِ ناقص میں یہاں "وؔلی" کے بجائے "وؔلے" بہتر ہوگا، اور کم ازکم پہلے شعر میں تو "وؔلے" ہی مناسب اور صحیح معلوم ہوتا ہے ورنہ مفہوم قطعی غیر موزوں ہوجائے گا، اگر یہ مثنوی کہیں مل سکتی تو ہمارے ادیب اس کا زیادہ گہرا مطالعہ کرسکتے، دوسرا شک یہ ہے کہ کتاب "دکن میں اردو" (طبع ثانی ص ۱۳۵) میں ہے کہ مخؔلم نے بھی سنہ ۱۲۳۱ھ میں مثنوی روضۃ الشہدا تصنیف کی، اور اس کے چند اشعار دیئے ہیں، دو یہ ہیں:-

چلانے جب لگے اعدا پہ تروار　　ہوئی وہاں سینکڑوں لاشوں کی انبار
چلائی تیغ وہ جب شاہ یثرب　　لگے پھر کانپنے ارض و سما سب

یہی دو شعر اسی کتاب کے صفحہ ۵۴ پر بھی ہیں جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ یہ ایک اور شخص کی وہ مجلس سے لئے گئے ہیں، جو سنہ ۱۲۳۰ھ میں مرتب ہوئی تھی، اگر ایسا نہیں ہے تو کچھ اور وضاحت زیادہ مفید ثابت ہوتی، بہرحال مجھے خوشی ہوگی اگر ہمارے ادیب ان شکوک کو رفع فرمائیں گے،

مثنوی پندنامہ | جو مخطوطہ میرے پیش نظر ہے اس کے حاشیہ پر ایک مختصر سی مثنوی "پندنامہ" بھی ہے، حاشیہ اتنا زیادہ کٹا پھٹا ہے کہ اس کے اشعار کا سمجھنا محال ہے، یہ مثنوی بھی مذہبی رنگ میں ہے، آخری تین شعر کچھ صاف ہیں،

ہویاں سو اُپر پانچ بیتاں تمام　　زصدقہ محمد علیہ السلام
اتھا سال ہجری اسے یک ہزار　　ربیع الاول ماہ، دیں ایتوار
سو تب یو مرتب ہوا ہے کلام　　تصرف کیا ویں . . . تمام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "پندنامہ" اتوار کے دن ربیع الاول سنہ ۱۰۰۰ھ میں مکمل ہوا، اس میں ۱۰۵ شعر ہیں،

مثنوی اساس المصلّی | اسی مخطوطہ کے شکستہ حاشیے پر ایک اور مثنوی "اساس المصلّی" ہے جس میں تقریباً تین سو شعر ہیں، جو نماز کے ارکان وغیرہ سے متعلق ہیں، آخری شعر یہ ہیں:-

اساس المصلّی ہوا سب تمام　　نبیؐ پر درود اں کہو والسّلام
کیا اشتیاقی نے دکھنی اسے　　سمجھ آئے گر ٹیک یو ہر کسے
سہنسر یو چوتھا اتھا سال جب　　مرتب ہوا یو رسالہ سو تب

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی شاعر اشتیاقی نے سنہ ۱۰۴۰ھ میں مثنوی "اساس المصلّی" عربی یا فارسی ماخذ سے دکھنی اردو میں منتقل کی، یہ دو مثنویاں بھی اسی خط میں ہیں جس میں روضۃ الشہدا، روضۃ الانوار اور روضۃ العقبیٰ لکھی ہوئی ہیں، اگر یہ سچ ہے کہ وہ دستخط (جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے) وؔلی ویلوری ہی کے ہیں تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید "پندنامہ" اور "اساس المصلّی" کے مصنف وؔلی کے بزرگوں میں سے ہوں گے یا کم ازکم وہ شاعر ایسے ضرور ہوں گے جن کی وقعت وؔلی کے دل میں ضرور ہوگی، ورنہ وؔلی جیسا باکمال اور پُرگو شاعر ہرگز کسی کا کلام نقل کرنے میں وقت صرف نہ کرتا،

(دارالمصنفین کی نئی کتاب)

دولت عثمانیہ جلد اوّل

یہ مسلمانوں کی زندہ حکومت ترکی کے عروج و زوال اور جمہوریہ ترکی کی مفصل تاریخ ہے، پہلے حصہ میں عثمان اول سے مصطفےٰ رابع تک پانچ صدیوں کے مفصل حالات ہیں، (اردو میں اب تک ترکی حکومت کی اس سے زیادہ مبسوط اور مستند تاریخ نہیں لکھی گئی) از مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے رفیق دارالمصنفین، ضخامت ۴۹۰ صفحے، قیمت: ہے

تلخیص و تبصرہ

مغل حکومت کی نوعیت

مندرجۂ بالا عنوان سے ایک ہندو اہلِ قلم کا مقالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے، اسکی تلخیص ذیل مین درج ہے،

ہندوستان کے مغل بادشاہون کی متنازعہ فیہ مذہبی پالیسی کے سلسلہ مین ان کی حکومت کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہوگیا ہے، کوئی اس کو استبدادی، کوئی مذہبی اور کوئی ربانی حکومت بتاتا ہے، اور یہ محض اس لئے کہ یا تو اب تک واقعات وحقائق کا عمیق مطالعہ کرنے کی کوشش نہین کی گئی ہے یا مغلون کی حکومت کو فقہاء کے اصول، علماء کے نظریے اور دوسرے اسلامی ممالک کے فرمانرواؤن کے طرزِ حکومت کے مطابق جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے، جو صحیح نہیں،

کہا جاتا ہے کہ اکبر پہلا مغل بادشاہ ہے جو ربانی حکمران تھا، خسرو نے جب بغاوت کی تو جہانگیر نے بھی اپنے کو حکومتِ الٰہی کا فرمانروا تسلیم کرانا چاہا، شاہجہان نے جب عادل خان والیٔ بیجاپور کو ایک خط تحریر کیا، تو اپنے کو ظلُ اللہ لکھا، عالمگیر اپنے کو خدا کا وکیل سمجھتا تھا، انہی واقعات کی بنا پر یہ خیال کیا گیا ہے کہ مغل بادشاہونکی سلطنت ربانی تھی، مگر یہ امر واقعہ نہین، مغل بادشاہ عام مسلمانون کی طرح یہ اعتقاد رکھتے تھے، کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا عطیہ ہے، اور وہ جو کچھ کرتے ہین، محض خدا کی مدد اور اشارہ سے کرتے ہین، مگر ان کا یہ اعتقاد یورپ کے بعض ربانی

حکمرانون کی طرح سیاسی رنگ مین کبھی تبدیل نہ ہوا، ان کے خلاف بغاوتین برپا ہوتی رہیں، لیکن ان کو فرو کرنے کے لئے مذہب اور شریعت کی آڑ نہین لی گئی، اکبر کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم نے ہندوستان پر حملہ کیا، تو اکبر مذہب اور شریعت کے پردہ مین پناہ لینے کے بجائے بابر کا وارث بنکر اور اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ کرکے مخالف فوجون سے نبرد آزما ہوا، اسی طرح اکبر کے خلاف شہزادہ سلیم، اور جہانگیر کے خلاف شہزادہ خسرو اور پھر خرم نے علم بغاوت بلند کیا، تو کسی قاضی کے شرعی احکام وفتاوی کے ذریعہ سے ان کو موردِ الزام قرار نہین دیا گیا، البتہ جب اورنگ زیب تخت پر بیٹھا، تو صدر الصدور نے شاہجہان کی موجودگی مین اورنگ زیب کا نام خطبہ مین شامل کرنے سے انکار کردیا تھا، لیکن اس سے تخت وتاج کی مذہبی تقدیس اور ربانیت ہرگز مراد نہ تھی،

تو اب سوال یہ ہو کہ اگر مغلون کی حکومت ربانی نہ تھی، تو کیا استبدادی تھی، ؟ ہان استبدادی تھی، ان کے نظامِ حکومت مین کوئی ایسا ادارہ نہ تھا، جو ان پر امتناعی حکم جاری کرسکے، مگر یہ تصور کرنا بالکل غلط ہے، کہ وہ رعایا یا سیاسی امور کے متعلق جو چاہتے تھے کر سکتے تھے، کسی حال مین بھی یہ تسلیم نہین کیا گیا، کہ وہ قوانین کے مالک ہین، بلکہ انکو اکثر یہ تسلیم کرنا پڑا، کہ وہ قوانین کے ماتحت ہین، ہندوؤن اور مسلمانون کے ذاتی قوانین علحدہ علحدہ تھے، جن مین مغل بادشاہون کو ترمیم، تنسیخ اور تبدیل کرنے کا کوئی حق نہ تھا، چنانچہ ہندوؤن اور مسلمانون کے ذاتی قوانین مین تغیر وتبدل کی کوئی مثال نہین،

اس زمانہ مین جب یورپین سیاح ہندوستان آئے تو اُن کو کوئی تحریری قانون نظر نہ آیا، لیکن یہ واقعہ ہو کہ تحریری قوانین موجود تھے، مگر ان کی تشکیل مین مغل حکومت کا کوئی حصہ نہ تھا، ان قوانین کی اتنی کثرت تھی، اور ان مین اس قدر پیچیدگیان پیدا ہوگئی تھیں کہ عالمگیر کو مجبوراً ان کو کتاب کی شکل مین ترتیب دینا پڑا، جو آج فتاویٰ عالمگیری کے نام سے مشہور ہے، اورنگ زیب نے

اسکی تدوین ایک بادشاہ کی حیثیت سے نہین، بلکہ اسلامی فقہ کے ایک طالب العلم کی حیثیت سے کی ہے، اور یہ اس کا کوئی ذاتی کارنامہ نہین، بلکہ اس کو علما اور فضلا نے سخت محنت کے بعد تیار کیا ہے، اور اس مین ہر مسئلہ اور رائے کے متعلق فقہا اور قضاۃ کی سند پیش کی ہے،

اسی طرح ہندوؤن کے قوانین کی کتابین بھی مرتب ہوئین، کاملاکر، راگھونندن، مترمطرا نرنگھ، اور دوسرے اہلِ قلم نے ہندوؤن کے قوانین کو ترتیب دینے مین قابلِ قدر محنت کی ہے، انھون نے قدیم قوانین کو نہ صرف مدون کیا، بلکہ متنازعہ فیہ اور پیچیدہ مسائل کو واضح کرکے نئے قوانین بھی بنائے، ان کی تدوین مین مغل بادشاہون نے کسی قسم کی مداخلت نہ کی، اور نہ ہندوؤن کی پنچایت کی کارروائیون مین انھون نے کبھی اپنی شہنشاہیت اور استبداد کا مظاہرہ کیا،

فوجداری کا قانون اسلامی تھا، رعایا کے باہمی جھگڑے اسی کی رو سے طے پاتے تھے، اور رعایا اور بادشاہون کے تعلقات مین بھی اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا، اکبر نے جب مذہب کو تبدیل کیا، تو بعض قوانین مین بھی تبدیلی کی، مگر یہ تبدیلی محض عامۃ الناس کے قوانین سے متعلق تھی، اور گو اس نے تبدیلی کی، مگر اوس نے قانون مین نظری حیثیت سے تغیر و تبدل کرنے کا دعوی کبھی نہیں کیا، اور نہ اپنے کو قانون سے بالاتر سمجھا،

اورنگ زیب کے زمانہ مین تو اسلامی قانون مین تھوڑی سی ترمیم کرنے کا بھی حق زائل ہوگیا، شرعی معاملہ ہو یا فوجداری کا قضیہ اورنگ زیب ہمیشہ مذہبی پیشواؤن سے مشورہ لیکر ان پر احکام صادر کرتا، آگے چل کر تو وہ تجارت اور صنعت پر ٹیکس لگانے مین بھی اسلامی قانون کا پابند ہوگیا تھا، مذہبی علما کی رائے کے مطابق اس نے تجارتی اجارہ کو بالکل موقوف کر دیا، وہ چیزون کا نرخ مقرر کرتا تھا، مگر جب اسکو معلوم ہوا کہ یہ غیر شرعی فعل ہے، تو اوس سے پرہیز کرنے لگا، ایک غیر مسلم قاتل اسلام قبول کرکے موت سے بچنا چاہتا تھا، مگر اورنگ زیب نے اپنا اسلامی جذبہ

کی شدت کے باوجود قاضی کے فیصلہ کو زیادہ اہم قرار دیا،

اس سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مغلون کی حکومت شرعی اور مذہبی تھی، مگر یہ بھی حقیقت نہین ہے، یورپ کی مذہبی حکومت مین ریاست کلیسا کے ماتحت ہوتی تھی، اسلام مین نہ کوئی کلیسا تھا، اور نہ مذہبی پیشواؤن کا نظام، اس لئے مسلمان بادشاہون کے عہد مین مذہبی حکومت کا تخیل ہی پیدا نہین ہوا، ہان مسلمان خلیفہ کو ضرور تسلیم کرتے تھے، مگر ان کا خلیفہ یورپ کے پوپ سے بالکل مختلف تھا، پوپ اپنی خواہش کے مطابق مذہبی قوانین مین مداخلت کرسکتا ہے، مگر خلیفہ کو اس قسم کا کوئی حق نہ تھا، وہ قرآن کے احکام مین کسی قسم کی تبدیلی نہین کرسکتا تھا، بعض فقہی مسائل مین اس کو ترمیم کا حق تھا، مگر اس کے لئے اجماعِ امت کی شرط تھی،

ان باتون کو ملحوظ رکھتے ہوئے مغلون کی حکومت کو مذہبی کیونکر کہا جاسکتا ہے، صدر الصدور کے غیر معمولی اقتدار سے یہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے، کہ مغلون کی حکومت تقریباً مذہبی تھی، اسلامی قوانین پر اسی کی رائے آخری ہوتی تھی، اور بادشاہ اس کے فیصلے کے سامنے بالکل بے بس اور مجبور رہتا تھا، اکبر نے بعض مختلف فیہ مسائل مین صدر الصدور کے فیصلے کو ماننا پسند نہ کیا، لیکن پھر بھی اس نے صدر الصدور کے عہدہ کو برقرار رکھا، عبد النبی کو علحدہ کرکے صدر جہان کو مقرر کیا، جو قوانین کی توضیح اور تشریح اسکی خواہش کے مطابق کرتا رہا، اورنگ زیب نے بھی ایسا ہی کیا، ایک صدر الصدور نے شاہجہان کی زندگی مین اس کے نام کا خطبہ پڑھنے سے انکار کردیا، تو اس نے اس کو علحدہ کرکے دوسرے صدر الصدور کو مقرر کیا، صدر الصدور اپنے فیصلے اور احکام مین بظاہر بادشاہ سے بالکل آزاد تھا، مگر بادشاہ اسکو عہدے سے علحدہ کرسکتا تھا، مذہبی احکام مین صدر الصدور کی حیثیت اہم ضرور تھی لیکن ملکی اور سیاسی معاملات مین اس کا کوئی دخل نہ تھا،

اورنگ زیب نے اپنے کو اسلامی قوانین کا ماتحت بنانے مین ایک نئی بات اور پیدا کی، اس نے

وکیلِ شرع مقرر کیا، جو رعایا کی طرف سے قانون کے مطابق بادشاہ کی ناانصافیون کا تدارک کرتے تھے
مغلون کی حکومت مذہبی تو نہ تھی، لیکن ان کو اسلامی حکومت کا علمبردار ضرور کہا جاسکتا ہے، اکبر فخر
سے کہا کرتا تھا، کہ اس نے اسلامی احکام وہان جاری کرادیے، جہان ان کا نام تک سننے مین نہ آیا تھا،
جہانگیر اور شاہجہان اپنے کو دین مبین کا حامی سمجھتے تھے، اورنگ زیب کی برابر یہی کوشش رہی، کہ ملک مین
اسلامی شعار کی ترقی ہو،

مسلمانون کا سیاسی نظریہ جو قرآنی احکام، اسلامی فرمانرواؤن کی مثال اور ایرانی غیر مسلم
حکمرانون کی روایات سے مل کر تیار ہوا، ہندوستان کے لئے موزون نہ ہوسکا، اورنگ زیب بھی
یہ فیصلہ نہ کرسکا، کہ ہندوستان کو دارالحرب یا دارالاسلام قرار دے، جب یہ طے نہ ہوسکا، تو لامحالہ اسلامی قوانین
مین ترمیم اور تبدیلی ہوتی رہی، جس سے یہ خیال جاتا رہا، کہ ہندوستان کے مسلمان بادشاہ اسلام کے
علمبردار رہے،

بہرحال مغلون کی حکومت ایک محدود قسم کی استبدادی حکومت تھی، جس کے فرمانروا، اسلام کے
وکیل تھے، اس استبدادیت مین رعایا کو نظری اور عملی حیثیت سے بڑی حد تک آزادی حاصل تھی اس مین
شک نہین کہ مغل بادشاہون کی بے جا کارروائیون کی روک تھام کے لئے کوئی ادارہ نہ تھا، لیکن ان
کے اعمال سے ناراضگی کا اظہار بغاوت کے ذریعہ سے ہوتا تھا، جو بہت ہی مؤثر حربہ تھا، پھر تخت وتاج
کی وراثت کا مبہم اور غیرواضح قانون بھی ان کی استبدادیت مین حائل ہوتا تھا،

اس حقیقت کو ہم کبھی نظرانداز نہین کرسکتے ہین، کہ مغلون نے اپنی رعایا کو بڑی حد تک آزاد
چھوڑ دیا تھا، اسی زمانہ مین یورپ کے حکمران اپنی رعایا پر ہرقسم کا جبر اور دباؤ ڈال رہے تھے، حتی کہ
ان کے مذہبی عقائد پر بھی پابندی تھی، اڈورڈ ششم کے زمانہ مین حکومت کے زور سے رعایا پروٹسٹنٹ
مذہب قبول کرنے پر آمادہ ہوئی، ملکہ میری جب تخت نشین ہوئی تو اس نے انگلستان کو رومن کیتھولک

بنا ڈالا، الزبتھ کے عہد مین انگلستان پھر پروٹسٹنٹ ہوگیا، یورپ کی موجودہ حکومتون کی مذہبی پالیسی
خواہ کچھ ہو، مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا، کہ سولھوین اور سترھوین صدی مین یورپ کی رعایا کے مذہبی عقائد
کا تعلق براہ راست حکومت سے تھا، حکومت کے اشارہ سے ان کے عقائد بدلتے رہتے تھے،
تنہا مغلون ہی کی ایک مثال ہے، جنھون نے اپنی رعایا کو مذہب و دین کے معاملہ مین بالکل آزاد چھوڑ
دیا تھا، انھون نے کوئی Act of Supremacy اور نہ Thirty-Nine Articles
اپنی رعایا پر نافذ کیا، حتی کہ مسلمانون پر بھی ارتداد اور ظاہری امور مین
اسلامی شعار کو برقرار رکھنے کے سوا کسی قسم کی پابندی عائد نہین کی،

"ض، ع"

مقدمۂ رقعاتِ عالمگیر

اس مین رقعات پر مختلف حیثیتون سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہانہ
مراسلات کی تاریخ، ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہین،
بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے مآخذ اور عالمگیر کی ولادت سے برادرانہ
جنگ تک کے تمام واقعات وسوانح پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی مین تنقیدی بحث کی
گئی ہے، قیمت :- للعہ، ۳۹ صفحے،

مضامینِ عالمگیر

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر اعتراضات اور ان کے جوابات، مورخانہ تحقیق وتنقید کا
ہندوستان مین پہلا نمونہ، قیمت عہ و عہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

جان ڈیوی کی سالگرہ

امریکہ کے سب سے بڑے فلسفی جان ڈیوی نے گذشتہ اکتوبر مین اپنی عمر کے ۸۰ سال تمام کئے، اس موقع پر ممالک متحدہ امریکہ کے تعلیمی اور علمی ادارون نے تزک و احتشام سے جلسے منعقد کئے، مگر جان ڈیوی ان جلسون مین شریک ہونے کے بجائے اپنی لڑکی کے مکان مین چھپا تھا، وہ ضرورت سے زیادہ منکسر المزاج اور شرمیلا واقع ہوا ہے، اسی لئے گو وہ ایک بہت ہی ممتاز اور نمایان فلسفی ہے لیکن کم لوگ اسکو جانتے ہین، مگر اس کے گہرے دوست اس کے مزاج کے میٹھے پن کو بہت زیادہ پسند کرتے ہین،

نجی زندگی مین وہ برابر کھویا رہتا ہے، وہ کسی سے ملنے کا وعدہ کرتا ہے تو اس کے یہان ایک ہفتہ کے بعد پہونچتا ہے، وہ پڑھانے کے لئے جاتا ہی، تو اکثر غلط کمرے مین داخل ہو جاتا ہی، لیکن اپنی بدخیالی کے باوجود وہ وعدون کا بڑا پکا ہے، وہ اصولاً کسی نوخیز فلسفی یا اہل قلم کا مسودہ نہین پڑھتا ہے، اور نہ اس پر اپنی کوئی رائے ظاہر کرتا ہے، مگر جب وہ اس کے لئے کسی سے وعدہ کر لیتا ہے، تو اس کا ایفا ضروری سمجھتا ہے، گو اس مسودہ کو اپنی بدخیالی مین کسی غلط پتہ پر بھیج دیتا ہے،

اس کا دلچسپ مشغلہ لفظی معما کا حل کرنا ہے، جاسوسی قصتون کو بھی وہ بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہے،

مگر اس کا وقت زیادہ تر غور و فکر مین گذرتا ہے، گھر کے شور و غل مین بھی وہ اپنے خیال مین محو رہتا ہے درجون مین اس کا سبق بہت ہی خشک ہوتا ہے، وہ اپنے سبق کو فصیح البیانی سے دلچسپ بنانے کی متعلق کوشش نہین کرتا ہی، ایک بار اس نے گریجوایٹ طلبہ کو تین گھنٹے تک لفظ [illegible] کے معنی بتائے، مگر آخر مین خود کہا "میرے ذہن مین بھی تھوڑا ہی سا واضح ہوا ہے" اسکی تحریرین بھی بڑی مغلق اور مشکل ہوتی ہین لیکن ممالک متحدہ کے سیاسی، مذہبی اور تعلیمی نظریون پر اس کے خیالات کا گہرا اثر پڑا ہے، خصوصاً تعلیم کے معاملہ مین اسکی رائے بہت ہی اہم سمجھی جاتی ہے، وہ کوئی خیالی مفکر نہین، بلکہ وہ جو کچھ لکھتا اور کہتا ہے، اس کو عمل مین لاتا ہے، چنانچہ بہت سے اسکول اور ادارے اس کے ماتحت کامیابی سے چل رہے ہین،

اس کے فلسفہ کا لب لباب اس ضرب المثل مین ہے، کہ "مٹھائی کی دلیل اس کے کھانے مین ہے۔" ڈیوی کے خیال مین سچائی کوئی مطلق چیز نہین، بلکہ حالات کے تغیرات کیساتھ یہ بھی بدلتی رہتی ہے، اس کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی خوبی ذہانت ہے، ذہانت کے معنے اُس نے یہ بتائے ہین کہ اس کے ذریعہ سے ایک مسئلہ کا حل ایسا ہو جو زیادہ سے زیادہ عمل مین آسکے، اور جس سے زیادہ سے زیادہ لوگ خوش رہ سکین، اسی لئے ڈیوی کے فلسفہ کی اخلاقی بنیاد جمہوریت پر ہے، اور وہ ایک سادہ آدمی فلسفی سمجھا جاتا ہی:-

اپنے بوڑھاپے کے باوجود ڈیوی پانچ سات ہزار الفاظ روزانہ لکھتا ہے، ان کو لکھکر ردی کی ٹوکری مین پھینک دیتا ہے، اور دوسرے دن پھر لکھنا شروع کرتا ہے، گذشتہ اٹھارہ مہینے مین اس نے تین بڑی اہم کتابین لکھی ہین، جو اس کی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے، اس کی سالگرہ کے موقع پر مختلف اہل قلم نے تین کتابین شائع کی ہین، ایک "آزادی اور کلچر" (Freedom and Culture) ہے جس مین ڈیوی کے نظریہ ذہانت

کی تشریح اور توضیح ہے، دوسری "جان ڈیوی" ہے، جس مین اس کی ذہنی تصویر پیش کی گئی
ہے، تیسری "جان ڈیوی کا فلسفہ" (The philosophy of John Dewey)
اس مین اس کی تین لڑکیون نے اسکی سوانح عمری لکھی ہے، پھر ۱۱ اکابر فلسفہ کے "جان ڈیوی" کے
فلسفہ پر مختلف اعتراضات اور تنقیدین ہین، آخر مین ڈیوی کے جوابات ہین،

نوبل پرائز

سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء مین طب اور عضویات مین نوبل پرائز دو شخصون مین تقسیم کر دیا گیا ہے، ایک
کورنیل ہیمنز (بلجیم) اور دوسرا جرہارڈ ڈوماگک (جرمنی) کو ملا، کیمیا مین بھی یہ انعام پروفیسر ایڈولف
بیوٹننڈٹ (برلن) اور پروفیسر لیوپولڈ روزیکا (زیورچ) مین منقسم ہوگیا ہے، دونون کی تحقیقات
Sex Hormone پر ہین، طبیعیات مین ممالک متحدہ امریکہ کے ماہر طبیعیات آرنسٹ اُو
لینڈ ولارنس کو ملا ہے، اسکی عمر ابھی ۳۸ سال کی ہے، وہ Cyclotron کا موجد
ہے جس کے ذریعہ سے مصنوعی شعاعی دھاتین نمک اور سونے کے ذرّے تیار ہوتے ہین، شروع
مین اس کا Cyclotron ۵۰ ٹن تھا لیکن آج اس کا پاس ۲۲۵ ٹن کا ہے، اور وہ ۲۰ ہزار
ٹن کا Cyclotron ایجاد کرنے کی فکر مین ہے، ادب مین نوبل پرائز فن لینڈ کے
ادیب فرانز ایمل سیلن پا کو ملا ہے، جب اسکو انعام کی خبر ملی تو خوشی مین دو ہفتہ تک برابر صرف شراب
پیتا رہا،

ہٹلر کا حکم ہے کہ جرمنی کا کوئی شخص یہ انعام قبول نہ کرے، حالانکہ دو چیزون مین یہ انعام
جرمنی ہی کے دو ماہرین فن کو ملا ہے، خیال کیا جاتا ہے، کہ جنگ کی وجہ سے نوبل پرائز کی تقسیم آیندہ
بند کر دی جائے گی

"ص ع"

باب التقریظ والانتقاد

الرق فی الاسلام حصہ اول

از مولینا سعید احمد صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ
غیر مجلد ۴ر، پتہ:- ندوۃ المصنفین قرولباغ دہلی،

ندوۃ المصنفین دہلی جو مفید علمی و مذہبی خدمات انجام دے رہا ہے، اس سے ارباب علم ناواقف نہین،
مذکورہ بالا کتاب ایک مفید اسلامی خدمت ہے، ہم کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی، کہ یہ کتاب ندوۃ المصنفین کے معیار
اور ہماری توقع کے مطابق ہے، یورپ نے اسلام کے متعلق جو غلط فہمیان پھیلائی ہین، ان مین سے ایک
یہ بھی ہے، کہ اسلام غلامی جیسی مذموم رسم کا حامی ہے، اس سے پہلے متعدد اہل علم نے اس الزام کی تردید
مین لکھا، جن لوگون کے دل و دماغ پر یورپ کی ہیبت چھائی ہوئی تھی، اور وہ ہر چیز مین اسی کے نقطۂ نظر
کو حسن و قبح کا معیار سمجھتے تھے، انھون نے تو اسلام مین سرے سے غلامی ہی کا انکار کر دیا، اور اسی
رنگ تاویلین کین، بعض علما نے صحیح نقطۂ نظر سے اسلام کی غلامی کی حقیقت پر روشنی ڈالی، لیکن اس
تفصیل کے ساتھ سب سے پہلے فاضل مؤلف نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، اس مسئلہ پر عربی اور اردو مین جو
کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ سب مؤلف کی نگاہ مین ہے، اس کے علاوہ غلامی کے متعلق اسلامی احکام اور دوسری
قومون مین غلامی کی تاریخ اور اس کے لٹریچر پر بھی ان کی نظر ہے، اسلئے انھون نے نفسیاتی، تاریخی، اخلاقی
اجتماعی، تمدنی اور اقتصادی ہر پہلو سے غلامی کی حقیقت، اس کے اسباب اور مختلف قومون مین اسکی تاریخ
اور اسکی شکلون پر بحث کرکے اسلام کی جائز کردہ غلامی کی صحیح شکل بیان کی ہے، کہ زمانۂ قدیم سے ساری
دنیا مین غلامی ایک ناگزیر چیز اور نظام معاشرت کا ایک ضروری جز تھی، اور مختلف ملکون اور قومون مین

بدترین شکل میں رائج تھی، وقتاً فوقتاً اسکی اصلاح کی کوششیں ہوئیں لیکن اسلام نے اس راہ میں سب سے زیادہ اصلاحی قدم بڑھایا، گو اس نے ناگزیر اسباب کی بناپر اسے مٹایا نہیں، بلکہ خاص شرائط کے ساتھ اسے جائز رکھا، لیکن جہان تک ممکن تھا، اسے گھٹایا، اس کی بری اور بدنما شکلیں دور کیں، غلامون کی آزادی کے لئے سہولتیں پیدا کیں، اسے کارِ خیر قرار دے کر آزادی کی ترغیب دلائی، غلاموں کو تقریباً مساویانہ حقوق عطا کرکے غلاموں کا درجہ بلند کر دیا، چنانچہ بہت سے صحابۂ کرام غلام تھے، اس سلسلہ میں غلاموں کے حقوق، ان کے مساویانہ درجہ اور ان کے بارہ مین آقاؤن کے فرائض اور ان کی ذمہ داریون پر تفصیلی بحث ہے، جن پر عمل کے بعد غلامی محض نام کی غلامی رہ جاتی ہے، پھر غلامی کے بارہ میں اسلام اور مسیحیت کے تخیل کا فرق دکھایا ہے، اور غلامی کے سلسلہ کی بعض جائز کردہ چیزون مثلاً غلاموں کی مملوکیت اور لونڈیوں سے تمتع وغیرہ پر جو اعتراضات کئے جاتے ہین، ان کے تشفی بخش جوابات دیئے ہین، آخر میں یورپ کی پیدا کردہ سیاسی غلامی پر دلچسپ بحث ہے، جو غلامی کے نام سے تو موسوم نہیں ہے، لیکن نتیجہ کے اعتبار سے غلامی سے بدتر ہے، خاتمہ میں ان لوگون کے دلائل پر تنقید ہے، جو اسلام مین غلامی کے منکر ہین، غرض اس کتاب میں غلامی کی حقیقت، اسکی تاریخ اور اسلام کی جائز کردہ غلامی پر نہایت مبسوط اور مدلل بحث ہے، اور اس مسئلہ پر اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ سب فاضل مصنف نے نئی معلومات نئے اضافون اور اپنی تحقیق کے ساتھ یکجا کر دیا ہے، اس اعتبار سے اس موضوع پر ایسی مبسوط کتاب نہین لکھی گئی،

"م"

کلیاتِ بحری

مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید ایم اے پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ضخامت ۲۲۰ صفحے قیمت ے رنولکشور پریس، لکھنؤ

اردو کی ترقی، اس کے مباحث کی وسعت، اور اس پر کام کرنے والون کی کثرت کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہو کہ جہان آج سے تقریباً تیس سال پہلے تک ایک ہی شخص کو ہر موضوع پر اظہارِ خیال

اور ہر فن پر کتاب لکھنا پڑتی تھی، اب ہر فن ہی نہیں بلکہ اسکی ماتحت شاخوں پر مستقل طور سے کام کرنے والے پیدا ہو گئے ہین، ہمارے لائق مرتب بھی اسی قبیل کے اپنے موضوع کے مستند محقق ہیں، ان کے قیام یورپ نے ان کے دل میں قدیم اردو کے مطالعہ کا شوق پیدا کر دیا تھا، پھر تھیاسوفیکل اور صوفیانہ خیالات کے مطالعہ و مقابلہ اور خانوادۂ چشتیہ کی ارادت نے ان کو تصوف سے قریب تر کر دیا تھا، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم ان کو روانگیٔ یورپ سے پہلے ہی دکن کے دو صوفی شعراء کی صوفیانہ تصانیف کے مطالعہ میں مشغول پاتے ہیں، تقریباً ۲۹ء میں پروفیسر حفیظ نے برہان الدین قائم اور قاضی محمود بحری پر چھوٹے چھوٹے مقالے سپردِ قلم کئے تھے، اسی وقت ہمارا خیال تھا، کہ یہ مضامین آیندہ کی وسیع تصنیفی عمارت کی بنیاد کا کام دین گے، اور بحمد اللہ آج ہم اس میں سے ایک کی عمارت کو مکمل پاتے ہیں، اس وقت تک بحری کے متعلق ڈاکٹر صاحب موصوف کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ایک انگریزی مین جو بحری سے متعلق ان کے مضامین، بحری کی غزلیات، اس کے انگریزی ترجمہ اور فرہنگِ الفاظ پر مشتمل ہے، لیکن مرتب موصوف چونکہ خود استاد اردو ہیں، اسلئے انھون نے بحری سے متعلق ہر قسم کے مفصل حالات کے اظہار کے لئے اردو ہی کو منتخب فرمایا، اس طرح اردو کے خزانہ میں کلیاتِ بحری کے انمول موتی جمع ہو رہے ہین،

اسلام کی توسیع و تبلیغ مین صوفیوں کا بڑا حصہ رہا ہے، ان کو خواص سے زیادہ عوام سے وابستہ رہنا پڑتا تھا، اس لئے ان کو اپنے حلقہ بگوشوں کی تسکین و طمانیت کے لئے انہی کے معیار کی انہی کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے، یہی وجہ ہو کہ عام گیت عموماً عام ترین زبان میں ہوتے ہین، اس چیز نے ہماری زبان کو بہت فائدہ پہونچایا، اردو کی ابتدائی تصانیف کا بڑا حصہ مذہبی عقائد اور صوفیانہ خیالات کا آئینہ دار ہے، قاضی محمود بحری بھی اس سلسلہ کے ایک بزرگ تھے، اور ان کی غزلیں، قصیدے، مثلث، مثنویان سب کی سب ایک بڑی حد تک تصوف کے رموز و نکات کی حامل ہین،

ڈاکٹر صاحب کو بحری کے کلیات کا ایک نسخہ ہاتھ لگا تھا، اس میں اسکی مشہور مطبوعہ مثنوی من لگن کے علاوہ اسکی ۹۰ غزلیں، ۲ قصیدے، مثلث اور ایک اور مثنوی موجود ہے، اب ڈاکٹر صاحب نے دوازدہ سالہ مطالعہ اور سفر یورپ کے معلومات کی روشنی میں بحری کے اس کلیات پر ایک مبسوط اور سیر حاصل مقدمہ لکھکر من لگن کے علاوہ بقیہ کلام شائع کر دیا ہے، مقدمہ مضامین کے اعتبار سے مختلف ابواب پر مشتمل ہے، ایک باب میں بیجاپور کی سیاسی تاریخ ہے، بہتر ہوتا کہ وہ اُس وقت کے سارے دکن کی سیاسی وسماجی تاریخ کو اسی اختصار کے ساتھ بیان کرتے، کیونکہ عادلشاہی اور بیجاپوری علاقوں کے حالات میں کوئی فرق نہ تھا،

تذکروں کے باب میں اگرچہ فہرست بڑی طویل ہے، حتی کہ اردو کے سہ پارہ تک کا اس میں ذکر ہے، لیکن پھر بھی لوگوں پر آزاد کی تقلید ہی کا الزام لگایا گیا ہے، وتی کو اس سلسلہ میں خواہ مخواہ اہمیت دی گئی ہے، اگر اس سلسلہ میں گذشتہ سال کے یوم ولی کے مقالات وغیرہ سے استفادہ کیا جاتا، تو اسکو گجراتی کے بجائے اورنگ آبادی نہ کہا جاتا، خود آزاد نے اسے گجراتی بتایا ہی گلشن گفتار کو میر و قائم کے تذکروں کے ساتھ رکھا جا سکتا ہی

بحری کے حالات میں رسالہ اردو، اور اردوے قدیم کی تمام معلومات کو خوبصورتی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے، البتہ مثنوی من لگن پر جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قابل ستایش ہے، اس عہد کی گرامر سے متعلق جو باب ہے، وہ ڈاکٹر صاحب کی لسانیاتی واقفیت کا بین ثبوت ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ گذارش ہی کہ اگر ڈاکٹر صاحب جو عرصہ تک بمبئی اور پونہ میں رہ چکے ہیں، صرف یہ مد نظر رکھتے کہ دکن کی اردو گجراتی زبان سے متاثر ہوئی ہے، نہ کہ پنجاب و دوآبہ کی پنجابی و ہریانی سے تو وہ بہت سی غلط تاویلات سے بچ سکتے تھے، مثلاً صیغہ مستقبل کی "سی" کو وہ دکن سے دوآبہ میں لے گئے، حالانکہ گجرات میں آج تک یہی نشے مستقبل کی مستقل علامت ہی،

اشعار کے ترجموں اور شرحوں میں ڈاکٹر صاحب نے جس دقت نظر کا اظہار کیا ہے، وہ قابل تحسین ہے اور فرہنگ الفاظ ان کے لسانیاتی معلومات کا آئینہ ہے، ہم ڈاکٹر صاحب کو ان کی اس کامیاب تصنیف پر مبارکباد دیتے ہیں، اور اردوے قدیم اور تصوف سے ذوق رکھنے والے اصحاب سے اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں، اردو میں اگر لسانیاتی و علمی حیثیت سے ایسے چند کام کرنے والے پیدا ہو جائیں، تو اردوے قدیم کا تمام ذخیرہ آسانی سے ادب پرستوں تک پہونچ سکتا ہے،

"ن"

مطبوعات جدیدہ

نبض مؤلفہ جناب حکیم عبد اللطیف صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ: شعبۂ تصنیف و تالیف طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

تشخیص مرض مین نبض کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہین، حکیم عبد اللطیف صاحب وائس پرنسپل طبیہ کالج علیگڈھ نے اس کتاب مین نبض کی حقیقت، اس کے اقسام، اس کے اسباب و نتائج اور مرض سے اس کے تعلق وغیرہ نبض کے ہر پہلو پر نہایت تفصیل و استقصا کے ساتھ بحث کی ہے، اور طب کی مستند کتابون سے نبض کے متعلق اکابر اطبا کی تحقیقات، ان کے خیالات اور اقوال کو سلیقہ اور قابلیت کے ساتھ جمع کر دیا ہے، چونکہ مؤلف خود صاحب نظر اور حاذق طبیب ہین، اسلئے محض قدما کے اقوال و خیالات کے نقل پر اکتفا نہین کیا ہے، بلکہ اس پر نقد و تبصرہ اور اپنی رائے بھی لکھے گئے ہین، یہ کتاب خالص فنی ہے، اسلئے اسکی اصلی قدر و قیمت کا اندازہ تو اس فن کے ماہرین ہی کر سکتے ہین لیکن مباحث کی نوعیت اور کثرت سے اندازہ ہوتا ہے، کہ کتاب بہت محققانہ ہے، اطبا کیلئے اس کا مطالعہ بہت مفید ہوگا،

ہندوستان کی تہذیب کی تکمیل، کالیداس صاحب کپور ام اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت :- ۵۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۸ر پتہ :- نولکشور پریس لکھنو،

مؤلف نے ہندوستان کی تہذیب پر لکھنؤ ریڈیو سے چند تقریرین کی تھین جسے کتابی شکل مین

شائع کر دیا ہے، اس مین ہندوستان کا جغرافیہ اسکی خصوصیات، قدیم آریون کی تہذیب بدھ مت کا ظہور، اس کے اثرات، دنیا کے مختلف حصون مین اسکی تبلیغ کے اثرات و نتائج، مذہب اسلام مسلمانون کی آمد، ہندوستانی تہذیب پر اسلامی تعلیم و تہذیب کے اثرات، مغلون کی تمدنی خدمات اور ان کے آثار، اور انگریزی دور کی تمدنی ترقیون کا ذکر ہے، اس طرح اس مختصر کتاب مین پراچین ہندوستان کے زمانہ سے لیکر موجودہ دور تک ہندوستان کے تمدن اور اس کے عہد بعہد کے تغیرات پر مختصر تبصرہ ہے،

سوشلزم مترجمہ باری صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۹۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ر مکتبہ اردو لاہور،

یہ کتاب کارل مارکس کے مشہور شریک کار فریڈرک اینگلز کی تصنیف ہے، اس مین اشتراکیت کی پیدایش کی فکری و عملی تاریخ ہے، کہ اشتراکیت کا ابتدائی تصور کیا تھا، کن اسباب کی بنا پر پیدا ہوا، اسکی ابتدائی شکلین کیا تھین، پھر فلاسفۂ یورپ کے خیالات اور دوسرے اسباب کے اثر سے اس مین کیا تغیرات ہوئے، اور کن معاشی اور صنعتی حالات کی بنا پر محدود اشتراکیت نے ایک وسیع شکل اختیار کی، اور آیندہ اسکی کیا شکل ہونی چاہئے، یا ہونے والی ہے، جناب مترجم سے التماس ہے کہ وہ اپنے نام کے ساتھ کسی اور جز کا اضافہ فرمالین، کہ ان کا نام لکھنے والون کو بڑی دشواری پیش آتی ہے، اگر وہ تنہا باری لکھتے ہین، تو تہذیب تحریر کے خلاف ہے، اور جناب کا اضافہ کرتے ہین تو مفہوم بدل جاتا ہے،

اجتماعی زندگی کی ابتدا مؤلفہ پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے استاذ جامعہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۸ر پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

اس کتاب مین انسان کے آغاز، اسکی ابتدائی ترقی، اور اسکے نظام اجتماعی کے حالات مین

پہلے باب مین انسان کی ابتدائی تاریخ اور دورِ انسانیت کے مختلف زمانون کے معاشرتی و تمدنی حالات اور اس دور کی ایجادات کا ذکر ہے، دوسرے باب مین ابتدائی نظام اجتماعی، اسکی مختلف قسمون اور مختلف قومون مین اسکی مختلف شکلون کا حال ہے،

مضامینِ فراق، جناب خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عدر، پتہ:- چمن اردو بک ڈپو، اردو بازار جامع مسجد دہلی وکتب خانہ علم وادب جامع مسجد دہلی،

یہ کتاب خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے، زبان کا لطف، بیان کی دلکشی اور دلی کی قدیم تہذیب وروایات کی مصوری، مؤلف کی مشہور خصوصیات ہین، جو ان تمام مضامین مین بھی موجود ہین، ان مین بیشتر مضامین ادبی اور بعض نیم تاریخی ہین لیکن زبان کا لطف اور دلی کی قدیم تہذیب کی جھلک سب مین ہے، سب مضامین دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہین،

نادر خطوط غالب - مرتبہ جناب سید محمد اسمٰعیل صاحب ایم اے رسا ہمدانی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت ۱۰؍ پتہ:- کاشانۂ ادب گھسیاری منڈی لکھنؤ،

اس زمانہ مین مرزا غالب کی ہر نادر ادبی یادگار ادبی تبرک کی حیثیت رکھتی ہے، اس سلسلہ مین جناب رسا ہمدانی نے مرزا کے یہ ستائیس نادر خطوط جو انکے مکاتیب کے کسی مجموعہ مین نہین ہین، شائع کئے ہین، انمین بیس مرتب کے جد سید شاہ کرامت حسین ہمدانی کے نام ہین تین صفیر بلگرامی کے نام اور ایک بہار کے ایک اور بزرگ شاہ فرزند علی صوفی کے نام، ان مین مرزا کے خطوط کی تمام خصوصیات موجود ہین، ابتدا مین مرتب کے قلم سے چند صفحون کا مقدمہ ہے جس مین غالب کی نظم ونثر اور ان کے خطوط کی خصوصیات پر مختصر تبصرہ ہے، غالب کے قدر دانون کیلئے یہ خطوط ادبی تبرک ہین،

خیابان، جناب محمود اسرائیلی صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۰، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ:- تاج آفس بھنڈی بازار نمبر ۳ بمبئی،

محمود اسرائیلی صاحب دورِ جدید کے مشہور شعرا مین ہین، خیابان ان کے کلام کا مجموعہ ہے، انھون نے جدید حالات اور نئی ضروریات کے تقاضے کے مطابق شاعری کا پرانا ڈھرا چھوڑ کر نیا راستہ اختیار کیا ہے ان کی شاعری گل وبلبل اور ہجر ووصال کا افسانہ نہین ہے، بلکہ زندگی کے حقائق کی تفسیر قومی وملی جذبات کی ترجمانی اور مناظرِ قدرت کی مصوری ہے، وہ ملک وملت کے غمگسار، اسرار حیات کے رمز شناس اور مناظرِ قدرت کے شیدائی ہین، ان کا پورا کلام اسی رنگ کا ہے، ان کی مذہبی، تاریخی اور اخلاقی نظمون مین شبلی کا رنگ، قومی اور سیاسی رجز مین ظفر علی خان کا جوش اور لطفِ بیان، اور معارف وحقائق کی تعبیر مین اقبال کا تخیل ہے، خفیف سی تغزل کی چاشنی بھی ہے، لیکن وہ شاعر کا اصلی رنگ نہین ہے، گو ان کی شاعری تمامتر جدید رنگ کی ہے لیکن وہ اس کی بے راہ روی سے پاک ہے، خیالات نئے ہین لیکن زبان وبیان کا لطف قدیم شاعری کا ہے، قومی اور مذہبی خیالات مین بھی قدم اعتدال کے دائرہ سے باہر نہین نکلا ہے، مناظرِ قدرت پر جو نظمین ہین، ان مین تغزل کی رنگینی ہے، کتاب کے شروع مین استاذ معظم مولینا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ ہے، جو شاعری کی حقیقت اور اس کے نئے مقتضیات پر نہایت جامع تبصرہ ہے،

رسول پاک، جناب عبدالواحد صاحب سندھی استاذ جامعہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۶۵ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی،

رسول پاک کی مختصر سوانح نگاری کی سعادت زیادہ تر جامعہ کے نوجوانون کے حصہ مین آئی ہے چنانچہ مکتبہ جامعہ سے مختلف نامون سے، بچون کے پڑھنے کے لائق کئی سیرتین شائع ہو چکی ہین انھی مین یہ نئی کتاب ہے، اس کے تین حصے ہین، پہلے حصہ مین ظہورِ اسلام کے مختصر حالات اور سوانح

نبوی صلعم ہین، دوسرے مین خلقِ نبوی کے واقعات، اور تیسرے مین ارکان اسلام، اور اُس کے فوائد بیان کئے گئے ہین، زبان سادہ آسان اور بچون کے مذاق کے مطابق ہے، ایک دو مقامون پر خفیف سا تسامح ہو گیا ہے، آنحضرت صلعم نے یہ جواب کہ "خدا کی قسم اگر مکہ والے میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھدین" کفار مکہ کو نہین، بلکہ اپنے چچا ابو طالب کو دیا تھا، اسی طرح انصار آپ کے حالات سُن کر تحقیق کے لئے مکہ نہین آئے تھے، بلکہ حج کے لئے آئے تھے،

رسالۂ دینیات مؤلفہ مولینا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۶ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مع محصول ڈاک ۱ر، پتہ دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور۔

مولینا ابوالاعلیٰ صاحب نے یہ رسالہ عرصہ ہوا لکھا تھا، اس کے پہلے اڈیشن پر معارف مین ریویو ہو چکا ہے، اس مین اسلام کے عقائد، اعمال، عبادات، اور حقوق وغیرہ، جملہ ضروری مسائل اور ان کی حکمتون اور مصلحتون کو نہایت دلنشین انداز مین لکھا ہے، یہ اس کا دوسرا اڈیشن ہے، اس مین مؤلف نے بہت سے مفید اضافے کئے ہین، یہ رسالہ خصوصیت کے ساتھ نوجوانون کے مطالعہ کے لائق ہے،

معین المنطق مؤلفہ مولینا محمود حسن صاحب مدرس اول جامعہ حسینیہ راندھیر، سورت، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر مصنف سے ملے گی،

منطق کوئی مشکل فن نہین ہے، لیکن اسکی جو کتابین عربی نصاب مین داخل ہین، اور ان کی تعلیم کا جو طریقہ ہے، اس سے عموماً طلبہ کو خالص فن کے مسائل ذہن نشین کرنے مین دشواری ہوتی ہے، فاضل مؤلف نے جن کی ساری عمر تعلیم و تدریس مین گذری، ہے، خالص فن کے تمام ضروری مسائل کو نہایت سہل اور دلنشین طرز مین اختصار و جامعیت کے ساتھ اردو مین لکھدیا ہے، اور روزانہ کی مثالون سے اس کی پوری تشریح کر دی ہے، ابتدائی جماعت کے طلبہ کیلئے یہ رسالہ مفید ہے، "م"

"جلد ۴۵" ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۰ء "عدد ۲"

مضامین